مجلس مطبوعات ادب و تحقیقات

ادبی مضامین
نثر و نظم کا
مجموعہ

ترتیب:
سیّد ابوالخیر کشفی

منتخب ادبی تحریروں کا مجموعہ

رفتار

ترتیب

سید ابوالخیر کشفی

مجلسِ مشاورت و معاونت

ڈاکٹر عبدالقیوم ــــــــ جمیل اختر خان

ڈاکٹر یونس حسنی ــــــــ بلقیس شاہین

مجلسِ مطبوعات و تحقیقاتِ اردو ، کراچی

ضابطہ

ناشر ـــــــ مجلسِ مطبوعات و تحقیقاتِ اردو، جامعہ نگر
جامعہ کراچی ۳۲،

سرورق ـــــــ انتظار احمد صدیقی

نگرانِ طباعت ـــــــ الحمرا پبلیکیشنز۔ کراچی

تاریخِ اشاعت ـــــــ جنوری ۱۹۸۳ء

قیمت ـــــــ بیس روپے



نقش، مرزا انور احمد دہلوی (مرحوم)

للہ الحمد کہ رحمت کی گھٹا چھائی ہے — محوِ تزئین ہے ہر سمت عروسانِ چمن
بزمِ عالم میں ہر اک سو چمن آرائی ہے — دیدۂ نرگسِ حیران تماشائی ہے

خوشخط ، مرزا نور احمد دہلوی (مرحوم)

رفتارِ نُما

ایک نقّاش

ایک شاعر ایک مترجم

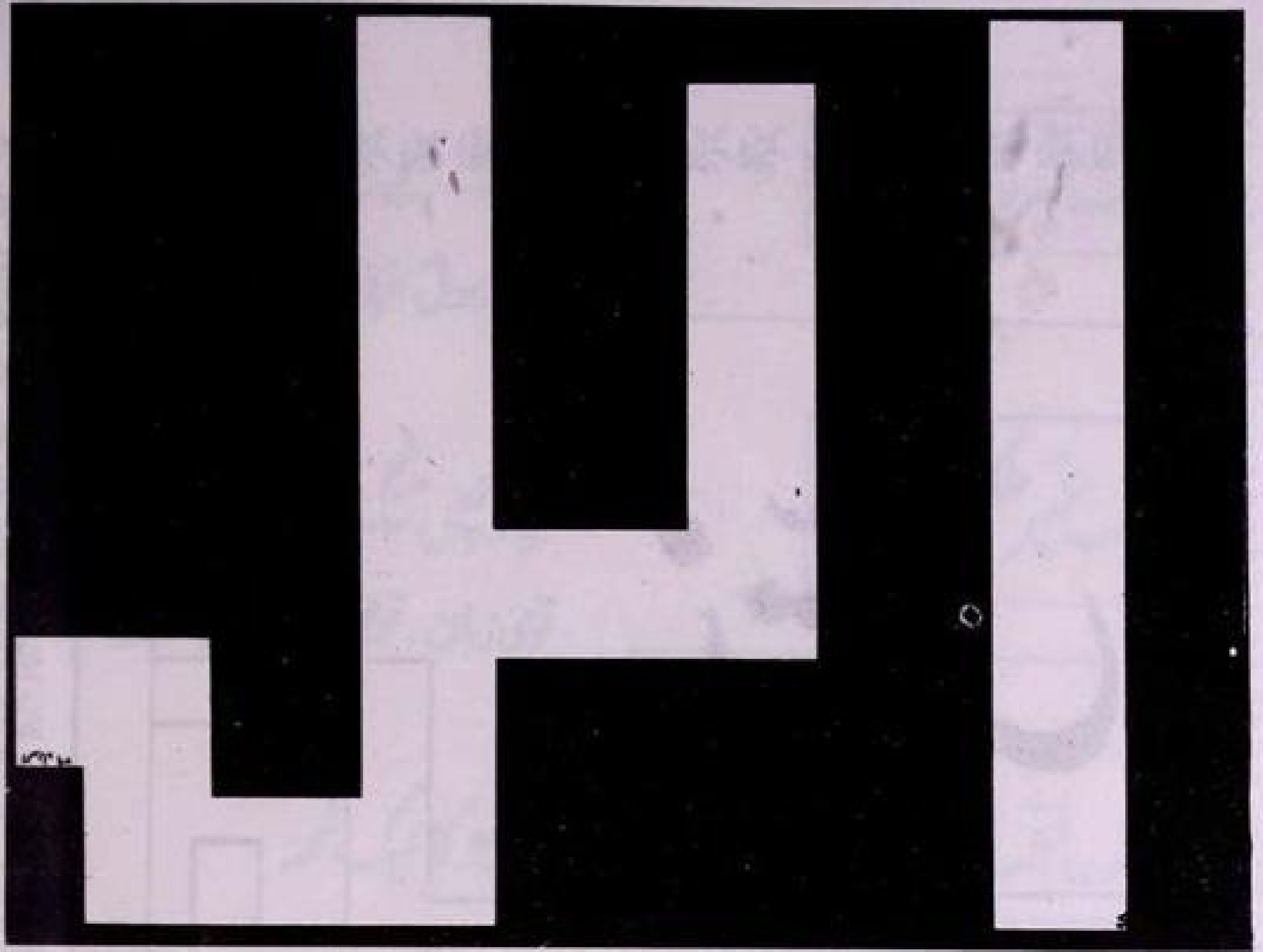
ایک ایجاد

ایک شاعر

ایک نقّاش

صادقین

سیّد ابوالخیر کشفی





صادقین

سیاہ و سفید

وہ جو ایک محاورہ ہے کہ یہ بات سیاہ و سفید میں آگئی ہے، یعنی یہ کہ قلم بند کردی گئی ہے، یہ محاورہ اپنی مکمل جامعیت اور معنویت کے ساتھ انور دل صاحب کے آئینہ خطاطی میں منعکس نظر آتا ہے۔ وصلیوں کے طول و عرض میں لفظ کی نشست کچھ اس انداز سے نظر آتی ہے کہ لفظ اسود کے باہر جو بر خواست ابیض ہے وہ بھی ایک اہمیت کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور پھر اس رشتۂ اسود و ابیض کی مساوات مجموعی طور پہ ایک توازن و تناسب کی وحدت میں ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔

حروفِ ابجد کے اتصال سے تشکیل لفظ ہوتی ہے تو اس میں معنئ لفظ کے حساب سے حروف ابجد خم و پیچ کھاتے چلے جاتے ہیں کہ مفہوم لفظ شکل لفظ سے عیاں ہو جائے۔ الفاظ میں کہیں جلال کی آن ہے تو کہیں جمال کی شان ہے۔

بحر الکاہل کے مشرقی کناروں پر دور دراز

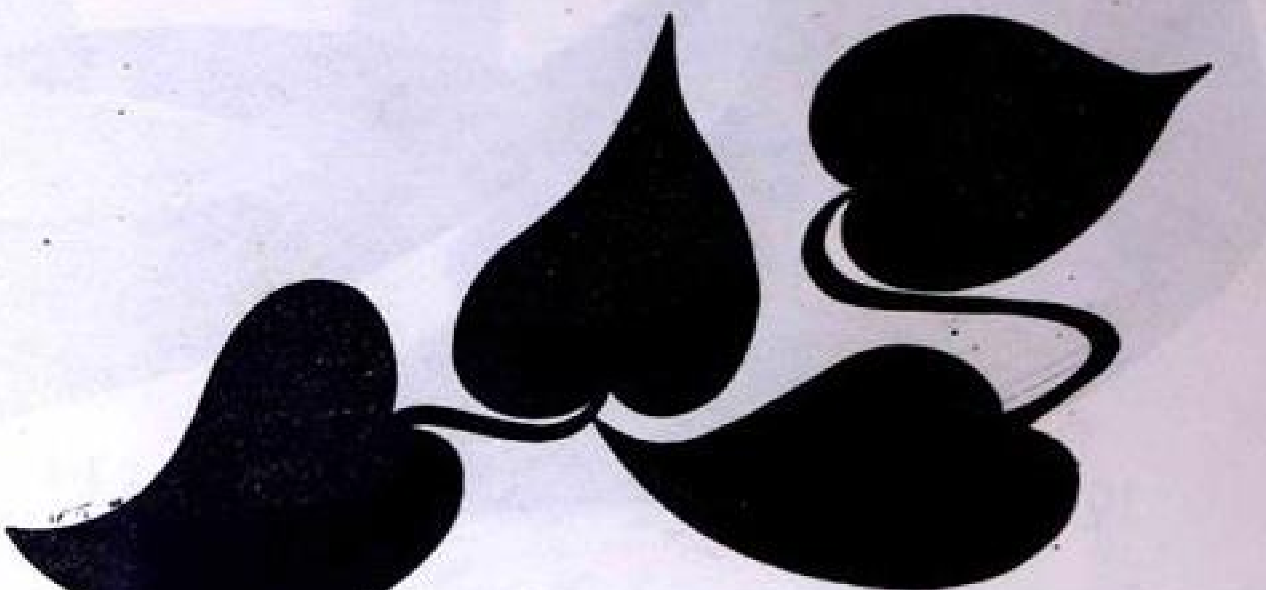
مقام سین ڈائیگو ہیں، جہاں عربی رسم الخط سے لوگ متعارف نہیں ہیں،
جس جذبۂ شوق سے کام کیا گیا ہے اُس میں تلاش حسن و جستجوئے جمال کی
ایک پُر خلوص جھلک نظر آتی ہے۔



یہ سعی و کاوش کا سلسلہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کام ان
کے قلم سے از خود ہی ہوتا چلا گیا ہے۔ فنکارانہ شعبدہ بازیوں کے علاوہ کام میں
جو خلوص شامل ہوتا ہے، وہی کام کی جان ہوتا ہے۔ انور دل صاحب کا کام
ہاتھ سے نہیں بلکہ دل سے کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔



عقل اصول بناتی ہے اور عشق اُن اصولوں کو توڑ دیتا ہے۔ ان کے کام میں عشق والی صورتِ حال ہے، محبوب کے نام کی مالا جپنا بھی شدّتِ خلوص کی نشانی ہے اِسی طرح محبوب کے نام کا لکھنا اور پھر طرح طرح سے لکھنا، بار بار لکھنا، نئی نئی صورتوں میں لکھنا بھی مدارجِ عشق میں شامل ہوتا ہے۔ جن برگزیدہ ہستیوں کے اسمائے گرامی انہوں نے رقم کئے ہیں، اُن سے ان کے اندازِ تحریر سے اِن کی عقیدت کی انتہا کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

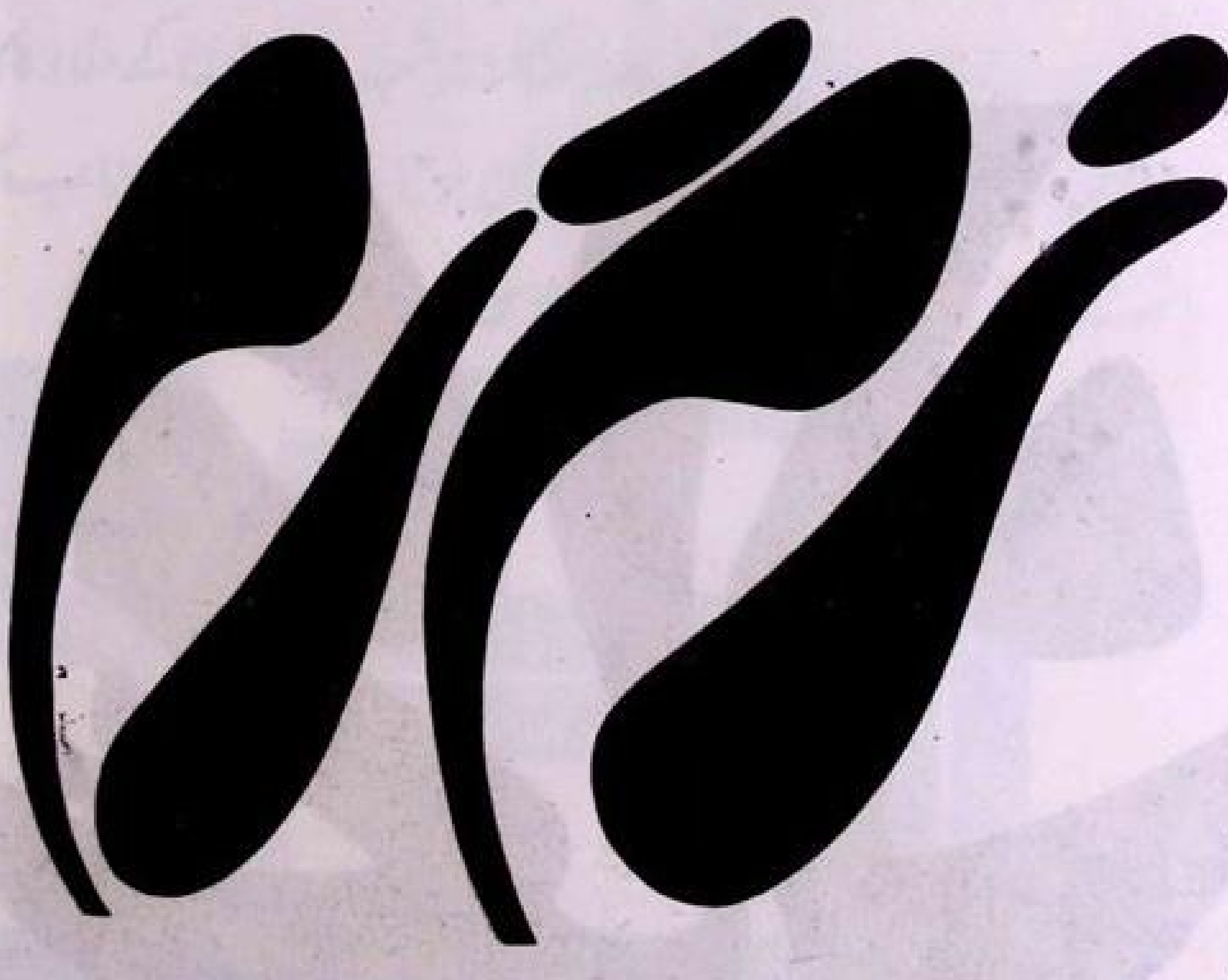


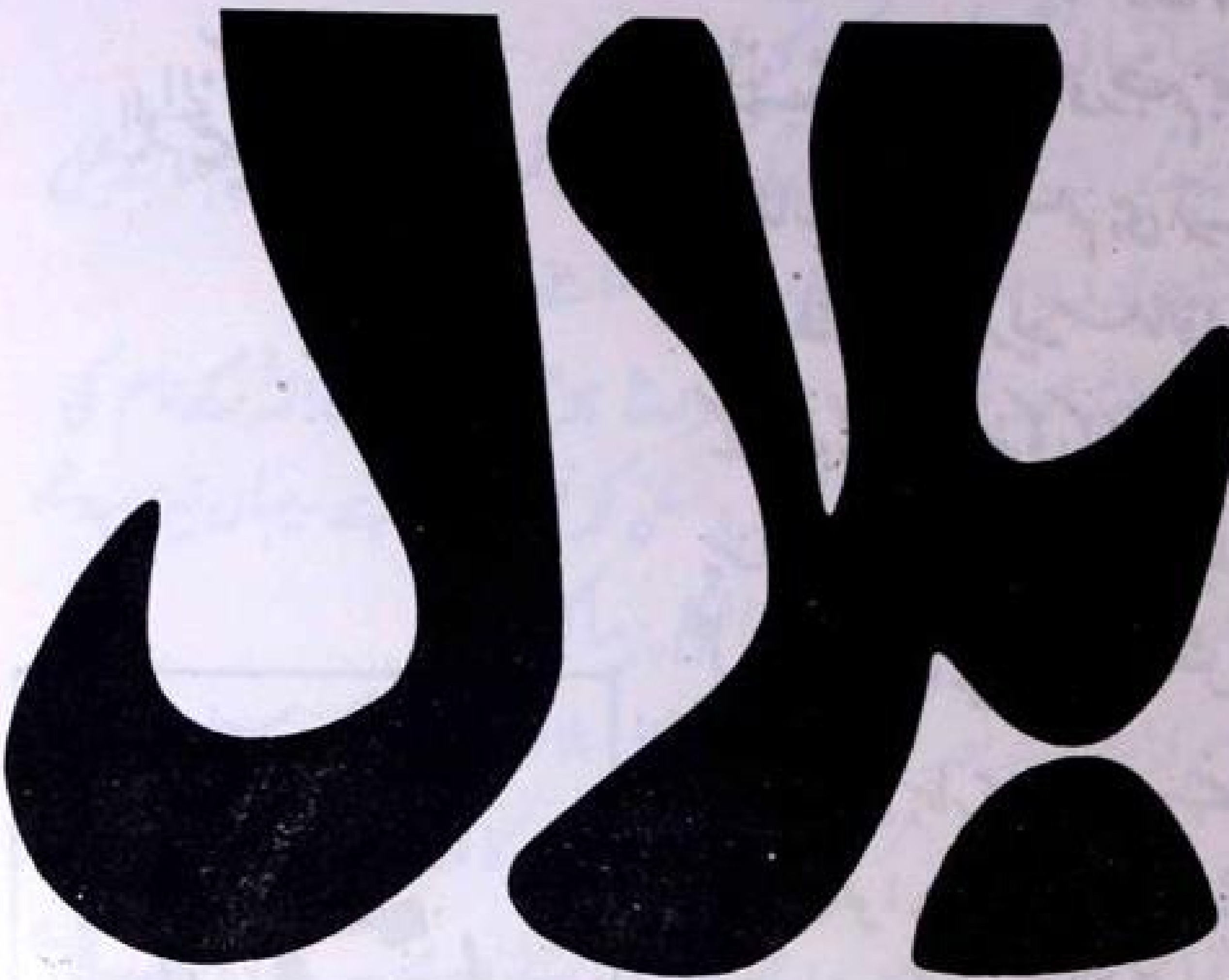


لفظوں کی ہیئت اور ساخت سے لفظ کی مابعدالطبیعاتی توانائی اور ماورائی طاقت کا بھی اظہار ہوجاتا ہے۔

بہرکیف یہ سیاہ و سفید کا ایک سلسلۂ پیچ و خم ہے۔

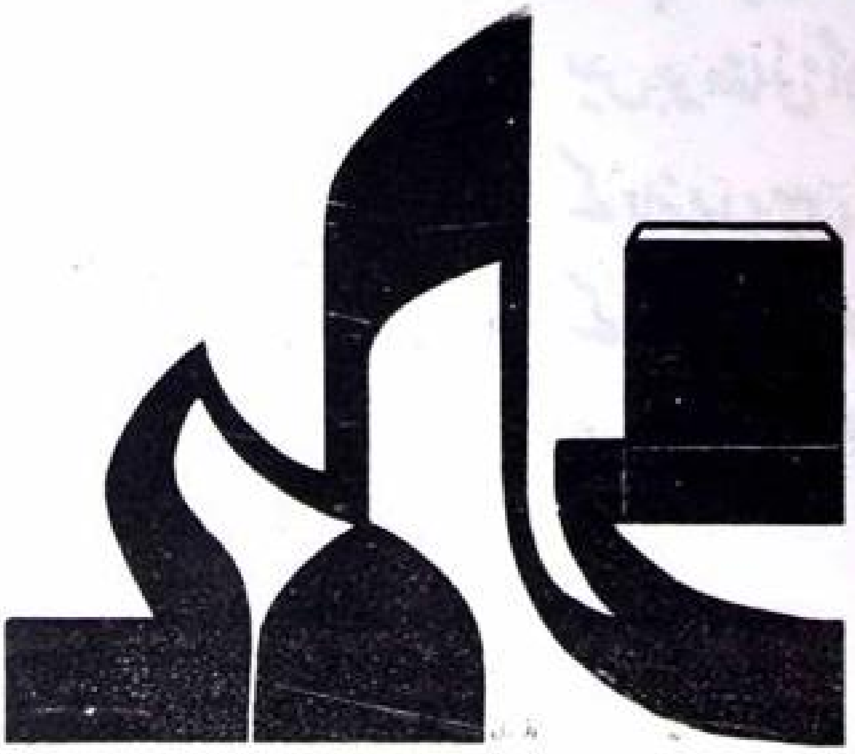






انور دل صاحب، اپنی دیگر معلمانہ مصروفیات سے فنِ خطاطی پر توجہ کرنے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں، یہ بھی ان کی ہمت اور حوصلے کی بات ہے، امریکہ میں بیٹھ کر اس فن میں نئے نئے زاویوں کی تلاش کرنا، نئے نئے قوس اور نئے نئے دائروں کی دریافت کرنا اور پھر اُن کے مجموعی توازن سے ایسی وصلیاں تیار کرنا جو نظر نواز ہو کر دل نشیں ہو جائیں قابل آفریں بات ہے۔

ان کے قلم میں طاقت ہے، زور ہے اور "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔



لذتِ دید

ابوالخیر کشفی

"کُن" سے کائنات کی تخلیق ہوئی۔
حرف آواز بھی ہے اور جسم بھی —
کائنات لفظ کا جسم ہی تو ہے۔

خطاطی کے ذریعہ مسلمانوں نے پردے
کے پیچھے بھی دیکھنے کی کوشش کی اور
پردے کے اس طرف ہر جلوہ کو اپنی
گرفت میں لینے کی کوشش کی۔

خطاطی ہماری میراث ہے، لیکن
میراث کو اپنے حال اور مستقبل کا
حصہ بنانے کے لیے تخلیق کی ضرورت
ناگزیر ہے — اور تخلیق ہزار دروازے
اپنے لئے کھولتی ہے اور اپنے لئے آدمی
کو خود چن لیتی ہے — انور شبنم دل
کو بھی خطاطی نے اپنے چن لیا ہے —
یا بہتر طور پر یوں کہوں کہ ربِ جلیل
نے اپنے دیار اور اپنے حبیبؐ کے شہر
میں جو حقائق اُن پر کھولے وہ خطاطی
کے دائروں میں ڈھل گئے — ان دائروں
کے درمیان خطوطِ مستقیم بہت نمایاں
ہیں — ان خطوں میں ہماری تاریخ

بھی ہے اور ایک فرد کا سفر بھی ہے۔ خط اور دائرے ـــــ انتہائی سادگی سے انتہائی گہرائیوں تک کا سفر ہیں۔

میں نے آج انور شبنم دل کی خطاطی کے نمونے دیکھے ـــ پہلا ردِ عمل یہ ہوا کہ جیسے چودہ صدیاں میری نظر کے سامنے سے گزر گئیں۔

سفر، اللہ اور خطِ کوفی سے شروع ہوتا ہے، لیکن اللہ کے نام کی قرطاسی ہیئت نے خطِ کوفی کی دائرہ صفتی کو فتح کر لیا ہے۔ یہاں تین سیدھے خط ہیں ـــــ "ہم نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے"

اسمِ ذات کے بعد اسما الحسنیٰ کا مطالعہ خطاطی کے وسیلے سے کیا گیا ہے۔ الرحمٰن ـــ الجلیل ـــ یہ نمونے کاغذ سے باہر نکلتے ہوئے۔ ایک ناتمامی کا احساس جو دو چیزوں کا اشارہ ہے ـــ پہلی بات تو ہمارے ذہن کی تنگ دامانی اور دوسری بات یہ کہ کارِ تخلیقِ ربِ جلیل جاری ہے

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

اور سورۂ فاطر میں یہی بات واضح طور پر کہی گئی ہے ـــــ
یزید فی الخلق ما یشآء ـــ وہ اپنی تخلیقات میں برابر اضافے کرتا رہتا ہے۔

آصف

اور پھر ذاتِ محمدیؐ کی جھلکیاں ہیں ـــــ اللہ اور محمدؐ دونوں میں
نقطے نہیں بلکہ یہ دونوں نام ہمارے ذہن میں ایسے نقطوں کا سلسلہ
تخلیق کرتے ہیں جو ہماری ذات اور کائنات کو وحدت اور سالمیت عطا
کرتے ہیں ـــــ ایک جگہ محمد میں "م" اور "د" کائنات کی اساس معلوم ہوتے ہیں۔
اور اوپر کائنات سے باہر نکل کر افق تک جا پہنچی ہے ـــــ پھر "ح" اور
"د" کے درمیان خالی جگہیں آغوش بن گئی ہیں۔ ہمیں ہمارے سارے
گناہوں کے ساتھ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ـــــ اسی نام "محمد" میں انور نے
بہت سی اشکال اور تاریخ کے مظاہر دیکھے ہیں۔ "خانۂ کعبہ"، "حجرِ اسود"،
"گنبدِ خضرا"، ـــــ محمد کے م اور حمد کے درمیان ہلکا سا فصل
اب اس نکتہ کی تفصیل کون بیان کرے۔



رفقائے رسولؐ رضی اللہ عنہم کے کردار اور مزاج تک خطاطی کے سہارے
رسائی ایک بڑا تجربہ ہے۔ ابوبکر میں "ب" کا نقطہ "دیدۂ بینا"
ہے ـــــ اگر آدمی دیدۂ صدیق سے دیکھے تو

عمرؓ از خدا محبوب تر گرد نبیؐ

"پھر "ب" اور "ک" کے امتزاج سے جیسے ایک کھلا ہوا مُنہ تخلیق ہوا ہے ــــ معصومیت ـ تشنگی ـ دریائے رسالتؐ سے ایک ایک قطرہ آب ہدایت حاصل کرتے ہوئے۔



عمر کے لکھنے میں انور نے کمال کردیا ہے ــــ تین فصل ــــ تین جہتیں ــــ ہرطرف پھیلاؤ ــــ اور پھر اغیار کے لئے جیسے عفریت ــــ انور نے "عثمان اور علی" کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے ــــ تفہیم کا انصاف۔ پرواز ــــ تحرک اور پیاس ــــ

میں پُرانی خطاطی کے ابجد سے کچھ واقف ہوں۔ جدید خطاطی کو سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے، لیکن نئے فن کاروں کے ہاں کسی بڑے تجربے کو دیکھنے کی آرزو، آرزو ہی رہی ــــ انور کی "وصلیوں"

کے فنی پہلو کی داد تو دوسرے دیں گے ہی، میں فن کا مبصر نہیں لیکن انور کے اس گہرے تجربے کو ضرور سمجھ سکتا ہوں جس نے خطاطی کا روپ دھار لیا ہے ـــــ یہی عشق ام الکتاب بھی ہے اور صراطِ مستقیم بھی ـــــ اسی عشق نے صادقین جیسے بڑے مصور سے خطاطی اور مصوری کو ہم آہنگ کرادیا ـــ "مرج البحرین" ـــ اور اس عشق نے انور جیسے ماہر لسانیات پر لفظ کی بصری ہیئت کے طلسم کو واکردیا ورنہ جدید لسانیات کو حرف کو آواز بنانے کی طرف مائل ہے۔



کراچی،
دید و تحریر، ۲۶ر دسمبر سنہ ۱۹۷۸ء

ایک شاعر ایک مترجم

مرزا

مرزا اسد اللہ خاں غالب

افتخار احمد خاں مدنی

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ ست ۔۔۔ آری کلامِ حق بزبانِ محمدؐ ست
آئینہ دار پرتوِ مہرست ماہتاب ۔۔۔ شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ ست
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق ست ۔۔۔ امّا کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ ست
ہر کس قسم بدانچہ عزیزست میخورد ۔۔۔ سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ ست
واعظ حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گزار ۔۔۔ کاینجا سخن ز سرو روانِ محمدؐ ست
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہ تمام را ۔۔۔ کاں نیمہ جنبشی ز بنانِ محمدؐ ست

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ ست

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ ۔۔۔ ترا کہ ہست و نیاشامی از بہار چہ حظ
خوش ست کوثر و پاکست بادہ کہ درو ست ۔۔۔ ازاں رحیقِ مقدّس دریں خمار چہ حظ
بذوقِ بیخبر از در درآمدن محروم ۔۔۔ بوعدہ ام چہ نیاز و ز انتظار چہ حظ
دراں چہ من نتوانم ز احتیاط چہ سود ۔۔۔ بدانچہ دوست نخواہد ز اختیار چہ حظ
بہ بندِ زحمتِ فرزند و زن چہ می کشیم ۔۔۔ ازیں نخواستہ غمہای ناگوار چہ حظ

بعرضِ غصہ نظیری وکیلِ غالبؔ بس
اگر تو نشنوی از نالہ ہای زار چہ حظ

جلوہ ہے حق کا طرزِ بیانِ محمدی
ہاں ہے کلامِ حق بزبانِ محمدی

خلوت نشیں ہے ترکشِ حق میں قضا کا تیر
پرواز اُس کی ہے بکمانِ محمدی

سُورج کی روشنی کا ہے آئینہ دار چاند
جلوہ ہے حق کی شان کا شانِ محمدی

کھاتے ہیں سب اسی کی قسم جو عزیز ہو
سوگند ہے خدا کی بجانِ محمدی

واعظ بیانِ سایۂ طوبیٰ نہ کر، جہاں
ہو گفتگوئے سروِ روانِ محمدی

دو ٹکڑے ہونا چاند کا کیا چیز ہے مگر
اِک جنبشِ خفیفِ بنانِ محمدی

غالبؔ ثنائے خواجہ کو یزداں پہ چھوڑ دے
ہے اِک وہی تو مرتبہ دانِ محمدی

ملے نہ مے تو مجھے لطفِ روزگار سے کیا
ہو بادہ اور نہ پئے تو تجھے بہار سے کیا

ہے خوب کوثر اور اس کی شراب اے واعظ
مئے طہور کو لیکن مرے خمار سے کیا

جو اپنے بس میں نہ ہو کیسی احتیاط اس سے
نہ جس پہ دوست ہو مائل اس اختیار سے کیا

اسیرِ زحمتِ فرزند و زن نہ کر یا رب
ملے گا رند کو غمہائے ناگوار سے کیا

ہوں محوِ آمدِ ناگہ کے ذوق میں ایسا
کہ مجھ کو مژدۂ ایفائے عہدِ یار سے کیا

اب عرضِ غم میں نظیری وکیلِ غالبؔ ہے
سُنے نہ تو، تو مجھے نالہ ہائے زار سے کیا

ظہور بخشش حق را ذریعہ بی سببی ست
وگرنہ شرم گنہ در شمار بی ادبی ست

زگیر و دار چہ غم چوں بعالمیکہ منم
ہنوز قصۂ حلاج حرف زیر لبی ست

رموز دیں نہ شناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی ست

بود بطالع ما آفتاب تحت الارض
فروغ صبح ازل در شراب نیم شبی ست

نہ ہم پیالگیٔ زاہدان بلا ی بود!!
خوش ست گرمیٔ بی غش خلاف شرع نبی ست

عبودیت نہ کند اقتضای خواہش کام
دُعا بصیغۂ امر است و امر بی ادبی ست

میانِ غالب و واعظ نزاع شُد ساقی
بیا بہ لابہ کہ ہیجان قوت غضبی ست

ظہورِ بخششِ حق کا بہانہ بے سببی
حذر ہے شرمِ گنہ کا شمار بے ادبی

مرے جہاں میں نہیں گیر و دار کا کچھ غم
ابھی ہے قصۂ منصور حرفِ زیرِ لبی

رموزِ دیں سے میں واقف نہیں کہ ہوں معذور
نہاد میری عجم سے طریق ہے عربی

مرے ستارے سے شرما کے مہرِ زیرِ زمیں
فروغِ صبحِ ازل ہے شرابِ نیم شبی

جو ہم پیالہ ہو زاہد تو بزم ہے آفت
خوشا کہ ہے مئے صافی خلافِ شرعِ نبی

عبودیت میں کہاں اقتضائے خواہش کا کام
دعا میں امر کا پہلو اور امر بے ادبی

ہوا ہے غالب و واعظ میں معرکہ ساقی
بالہ دے کہ ہے ہیجان قوتِ غضبی

افتخار احمد خاں عدنی۔ مصطفٰے خان شیفتہ کے گھرانے کی روشنی، تحریکِ پاکستان کے قائد نواب اسمٰعیل خاں کے فرزند، نیپا (NIPA) کراچی کے ڈائریکٹر

غالب نے عبوری دور میں آنکھ کھولی تھی، ایسے زمانے میں آدمی پُرانی دیواروں کو گرتے ہوئے تو آسانی سے دیکھ سکتا ہے، اِن سے محبت ہوتی ہے تو ان کا ماتم بھی کر لیتا ہے، لیکن ان کی تہہ میں سے کسی دیوار کو اٹھتے ہوئے دیکھنا، ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کو دیکھ کر اس سے محبت کرنا اور بھی دشوار ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ دیکھنے والے میں خود بھی شکست و ریخت جاری رہتی ہے، اس کے اپنے اغراض اور اس کا اپنا ماضی ہوتا ہے، جس سے قطع تعلق معمولی بات نہیں۔

غالب، تقلید اور اجتہاد (صفحہ ۲۵۸)

پروفیسر خورشید الاسلام

ایک ایجاد

احمد مرزا جمیل

محمد طفیل

حسن الدین احمد

عظمت عزمی



مرزا نور احمد مرحوم

جن کے نام پر اردو کمپیوٹری نستعلیق نظام کو نوری نستعلیق

کا نام دیا گیا



احمد مرزا جمیل

احمد مرزا جمیل

ایک نشریہ

نوری نستعلیق

اردو خطاطی کا کمپیوٹری نظام

پاکستان کی قومی زبان اردو، آج دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان ہے۔ کئی معتبر مورخوں کے نزدیک اردو بارھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ پنجاب میں پیدا ہوئی۔ پنجاب جو اسلامیہ جمہوریۂ پاکستان کا دھڑکتا دل ہے۔

اردو برِ اعظم پاک و ہند کے ہر حصّہ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ پھر یہ زبان کئی دوسرے ملکوں، بالخصوص پڑوسی ملکوں اور یورپ تک پھیل گئی۔ یہ زبان سیّاحوں اور تاجروں کے ذریعے پھیلی، جن کا برِ عظیم سے رشتہ تھا۔ آج آباد کاروں کی ایک بڑی تعداد کی وجہ سے برطانیہ اور مشرقِ وسطیٰ کے کئی ملکوں کی قومی زندگی میں اردو کا بڑا عمل دخل ہے۔ ان ملکوں میں اردو کے اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر اردو کے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔

نستعلیق رسم الخط کی تاریخ کا آغاز چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں ہوا۔ کوفی رسم الخط عہد بہ عہد کی تبدیلیوں سے روشناس ہوا، اور دسویں صدی کے آغاز میں خلیفہ مقتدر باللہ کے عہد میں نسخ رسم الخط وجود میں آیا۔ اور اس کا سہرا اُس کے وزیرِ اعظم ابن مُقلہ کے سر ہے۔ مدتوں یہی رسم الخط عربی زبان کا طرۂ امتیاز رہا۔

چند ہی برسوں بعد امیر تیمور کے عہد کے مشہور خطاط میر علی تبریزی نے نسخ اور ترکوں کے رسم الخط تعلیق کو ملا کر نستعلیق کا آغاز کیا۔

شہنشاہِ ہند، شاہجہان کے عہدِ حکومت میں خداداد صلاحیتوں کے مالک عظیم ایرانی خطاط آقا عبدالرشید دیلمی نے لاہور کو نستعلیق رسم الخط کے عہدِ جدید کا مرکز بنا دیا۔

اردو رسم الخط کو مشینی بنانے کی کوششیں اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہو گئیں۔ انگریزوں نے نستعلیق کی مقبولیت کو سامنے رکھتے ہوئے اسے ٹائپ میں ڈھالا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے پریس سے ۱۸۰۱ء سے ۱۸۱۲ء تک اردو کی کئی کتابیں شائع کی گئیں۔ اردو نستعلیق رسم الخط کو دھات کے ٹائپ میں ڈھالنے کی کوشش کئی اداروں کی طرف سے ۱۹۳۰ء تک جاری رہی۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے یہ یہ کوششیں ترک کر دی گئیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لیتھو کی چھپائی کو اُس زمانے میں فروغ حاصل ہوا جو ٹائپ کی چھپائی سے زیادہ سستی اور دیدہ زیب تھی۔

ہمارے عہد میں کتابت اردو زبان کی ترقی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ تیز رفتاری کے اس دور میں کتابت کو اپنائے رہنا جیٹ طیارے کی جگہ بیل گاڑی سے سفر کے مترادف ہے۔

طباعت کی صنعت سے وابستگی کے ساتھ ہی مجھ میں یہ عزم اور پختہ ارادہ تھا کہ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے کچھ کیا جائے۔ میں نے فوٹو مکانیکی ساز و سامان کے ساتھ کئی تجربے کئے لیکن جمالیاتی ذوق کی تسکین اور رفتارِ کار کو تیز تر کرنے کے سلسلے میں کوئی بڑی کامیابی

حاصل نہ ہوسکی۔

آخرکار جناب مطلوب الحسن سید کی رفاقت میں، اللہ کے فضل سے کامیابی ہمارا مقدر بنی اور اردو خطاطی کا کمپیوٹری نظام ایک حقیقت بن گیا۔ اسی کو "نوری نستعلیق" کا نام دیا گیا ہے اب تک اس سلسلے میں جو کوششیں کی گئی تھیں ان کا انحصار حروف کے ٹکڑے جوڑنے پر تھا جن کی اردو میں ابتدائی، درمیانی اور آخری شکلیں، جگہیں اور امتزاجی ترکیبیں عمودی اور افقی طور پر بہت مختلف ہوتی ہیں۔

"نوری نستعلیق" نے جوڑوں کے اس مسئلہ کو ختم کر دیا۔ جو اردو رسم الخط کو مشینی بنانے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ (اس بات کو میں یوں کہتا ہوں کہ اردو رسم الخط کو جوڑوں کے درد سے نجات مل گئی)۔

"نوری نستعلیق" میں الفاظ کو LIGATURES یعنی ترسیموں میں تقسیم کیا گیا۔ اردو کے کم و بیش تمام الفاظ کو دو سے آٹھ حرفوں تک کے ترسیموں میں منتقل کر دیا گیا۔ اور اب یہ ترسیمے ایک سادے KEYBOARD، یعنی تختۂ حروف کے ذریعے ڈھائی لاکھ لفظوں کی صورت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان ترسیموں کی کتابت سائنسی بنیادوں پر کی گئی ہے اور انہیں مختلف پوائنٹ کے ٹائپ میں بدل کر کمپیوٹر کے حافظے میں محفوظ کر دیا گیا۔ برطانوی مونوٹائپ کارپوریشن کی LASERCOMP ٹائپ سیٹنگ مشین اس بے مثل نظام کے لئے خاص طور پر (تغیر و تبدل کے ساتھ) استعمال کی گئی۔

"نوری نستعلیق" کی ایجاد نے ایک ہی جست میں اردو کو انتہائی ترقی یافتہ برقیاتی اور لیزر ٹکنالوجی کے عہد میں پہنچا دیا۔ کم و بیش پانچ سو صفحات کی، جس کتاب کی کتابت، کاتب ایک سال سے پانچ سال کے عرصے میں کرتا تھا اب اسے "نوری نستعلیق" کے طریقۂ کتابت کے ذریعے ایک ہفتے سے کم کی مدت میں اشاعت کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔ نوٹوگرافک کاغذ، یا فلم پر۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان)

محمد طفیل

انقلاب آفریں کارنامہ

یہ دور سائنس کا دور ہے۔ عجیب عجیب ایجادات ہو رہی ہیں۔ سنتے ہیں کہ سائنسدان اس کوشش میں ہیں کہ وہ آوازیں جو صدیوں پہلے مُنہ سے نکلی تھیں۔ جس کسی کے بھی مُنہ سے نکلی تھیں، اُن تک رسائی حاصل کر کے، انہیں پھر سے سُنا جا سکے۔ خدا کرے ایسا ہماری زندگی میں ہو جائے تاکہ ہم اپنے اسلاف کی گفتگو سُن سکیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو سن سکیں، جو کہہ رہے ہوں،

"میں تم میں وہ چیز چھوڑے جاتا ہوں جسے مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، یہ اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے"

ہم خالد بن ولید کی آواز کو سُن سکیں کہ جو کہہ رہے ہوں،

"مجھے شہادت کی بڑی آرزو تھی" لیکن میرے لئے مقدر یہی تھا کہ میں بستر پہ جان دوں"

ہم سقراط کی آواز کو سُن سکیں کہ جو کہہ رہا ہو کہ

"میں اصولوں کی خاطر زہر کا پیالہ پی رہا ہوں"

کیونکہ میرا تعلق اردو ادب سے ہے۔ اس لئے مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اگر میں میر تقی میر کی زبان سے سُن سکوں ؎

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں، ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد، یہ باتیں ہماریاں

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ سائنس کا دور ہے۔ بے شک ایجادات اللہ کی رحمتیں ہیں بشرطیکہ انہیں صحیح طور پر استعمال کیا جا سکے اور سائنس کی ایجادات؛ ایسا عذابِ الٰہی بھی ہیں کہ جو ان کا غلط استعمال ہو۔

سائنسی ایجادات کے اس ماحول میں، ایک ایجاد ایسی ہوئی ہے۔ جو سراسر انسانی بہبود کے لئے ہے جس کا غلط استعمال نہیں ہو سکتا۔ میری مراد" نوری نستعلیق" سے ہے۔ اردو کے نستعلیق رسم الخط سے متعلق!

اس دُنیا میں بے شمار لوگ آتے ہیں جو اپنے دن گزار کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ، بعض مخصوص کاموں کی تکمیل کے لئے خود چُنتا ہے۔ ان میں ایک احمد مرزا جمیل ہیں دوسرے اُن کے رفیق مطلوب الحسن سید!

نوری نستعلیق کا یہ کارنامہ، کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ یہ نشر و اشاعت کی دُنیا میں ایک انقلاب آفریں کارنامہ ہے۔ اس مشین کی ایجاد سے اردو ایک ہی جست میں بین الاقوامی زبانوں کے زمرہ میں آ گئی ہے۔

سنگاپور میں منعقد ایک نمائش میں، مرزا جمیل صاحب کی نظر ایک کمپیوٹر پر پڑی۔ انہوں نے مونوٹائپ کارپوریشن کے سیلز ڈائرکٹر سے بات کی۔ بس یہ وہ لمحہ تھا جسے لمحۂ عالیہ کہا جاتا ہے۔

چنانچہ مرزا جمیل صاحب اور مطلوب الحسن سید صاحب نے مشکلات کے پہاڑ کاٹنے شروع کر دیئے۔ اور مونوٹائپ کے تعاون سے خطِ نستعلیق کو کمپیوٹر کے ذریعہ بنانے میں

کامیاب ہو گئے۔ بقول مونو ٹائپ کے منیجنگ ڈائریکٹر کے کہ اردو کتابت کا یہ کمپیوٹر نوری نستعلیق تیار کرنے میں جن فنّی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا تجربہ اُنکی فرم کو، دنیا کی کسی دوسری زبان کے کمپیوٹر تیار کرنے میں نہیں ہوا۔

خُدا اگر ایک لفظ کُن سے اِس کائنات کی تخلیق کر سکتا ہے تو اس کے بندے، اُسی کی دی ہوئی صلاحیتوں سے، کُن کا لفظ دُہرا کر نوری نستعلیق مشین بنا سکتے ہیں. بس فرق خدائی اور بندگی کا ہے۔ خدا کُن کا لفظ ادا کرتا ہے اور کائنات وجود میں آجاتی ہے اور یہ کُن کا لفظ نومبر ۱۹۷۹ء سے مئی ۱۹۸۰ء تک دُہراتے رہے۔

اس مشین کی رفتار تین ہزار چھ سو حروف فی منٹ ہے اور یہ مشین اپنے حافظہ میں پینسٹھ ہزار (۶۵,۰۰۰) الفاظ رکھ سکتی ہے جو وہ آپ کے ایک اشارے پر کاغذ پر منتقل کر دے گی. رفتار کی تیزی کا یہ عالم ہے کہ ڈیڑھ منٹ میں، اخبار کا ایک صفحہ کتابت کر سکتی ہے۔

ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ایک وہ دن آنے والا ہے کہ جب مجھ سا کوئی عام آدمی اپنے خیالات کو مربوط کرکے اور یکسو ہو کر، مشین کے سامنے بیٹھ جائے گا جو کچھ اس کے ذہن میں ہوگا وہ کچھ ٹک ٹک کی آوازوں سے گزر کر، چھپی چھپائی صُورت میں سامنے آجائے گا۔

سب سے پہلے انگریزوں نے ۱۷۴۳ء میں اُردو زبان کا ابتدائی ٹائپ بنانے کی کوشش کی اور متعدد کتابیں چھاپیں۔ اس کے بعد نواب وصی الدین حیدر اور سر سید احمد خاں نے ٹائپ کو مقبول بنانے کی کوشش کی جو خطِ نسخ ہی کی ایک شکل تھا مگر وہ مقبول نہ ہوا۔

اس کے بعد ریاست حیدر آباد دکن میں خطِ نستعلیق کی صورت میں مقبول بنانے کی بھرپور کوشش کی، غرض متعدد کوششوں کے بعد جو اس کام کا نقطۂ عروج ہے، وہ نوری نستعلیق کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

پوری دنیا میں اردو زبان کو ۸۵ املین حضرات جانتے اور بولتے ہوں گے۔ لہٰذا احمد مرزا جمیل صاحب اور مطلوب الحسن سیّد صاحب ۸۵ املین حضرات ہی آپ کے

ممنون ہوں گے اور ان ۱۸۵ ملین میں، اردو کا ایک داعی اور ناچیز خادم محمد طفیل بھی ہے۔!

محمد طفیل:۔ اردو کے تاریخ ساز رسالہ "نقوش" کے مدیر۔ صاحبِ طرز خاکہ نگار۔ خاکوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ادارہ مصنّفین پاکستان کے سیکرٹری جنرل رہے۔

نوری نستعلیق

قومی اہمیت کی ایجاد

۱۷۴۳ء سے آج تک خط نستعلیق کو مشینی دور سے ہم آہنگ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوتی رہی ہیں نوری نستعلیق کی ایجاد نے اردو زبان کو اس کے روایتی رسم الخط میں کمپیوٹر کتابت کے ذریعے ایک ہی جست میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف اول میں لا کھڑا کیا ہے۔ مذکورہ طریقہ بہت پسند کیا گیا ہے اور فن خوش نویسی کی تاریخ میں ایک بے مثال کارنامہ قرار دیا گیا۔ اردو طباعت کا یہ نمونہ مونو ٹائپ کارپوریشن کی "لیزر کامپ" مشین پر تیار کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ برقی کتابت حسن خط اور تیز رفتاری کے پیش نظر اردو زبان کو فروغ دینے میں انقلابی کردار ادا کرے گی۔

نوری نستعلیق کا نمونہ

حسن الدین احمد (آئی اے ایس ریٹائرڈ)

کمپیوٹر سے اردو کتابت

اس وقت جو رسمِ خط اردو میں رائج ہے اس کی اصل نسخ ہے جسے ابنِ مقلہ نے جو بلند پایہ خوشنویس اور عالم تھے ۱۱۲۳ء میں عربی زبان کے لئے وضع کیا۔ جب یہ رسمِ خط ایران پہنچا تو اس میں خالص ایرانی آوازوں کی علامات پ، چ، ژ، گ، کا اضافہ ہوا۔ اور کشش میں تبدیلی ہو کر یہ پہلے تعلیق اور پھر نستعلیق بن گیا جب اردو اس رسمِ خط میں لکھی جانے لگی تو اس میں خالص اردو آوازوں کے لئے، ٹ، ڈ، اور ڑ کا اضافہ ہوا۔ نستعلیق کی خوبصورتی کا مقابلہ دُنیا کا کوئی رسمِ خط نہیں کر سکتا۔ برِ صغیر میں نستعلیقی تحریر میں وہ امتیاز پیدا کیا گیا جس کی نظیر کسی اور زبان کے رسمِ خط میں ملنی مشکل ہے۔

جہاں تک طباعت کا تعلق ہے، سولہویں صدی عیسوی کی ابتداء ہی میں یورپ والوں نے عربی کتابیں ٹائپ میں چھاپنی شروع کر دیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی ابتداء ہی سے یعنی لگ بھگ ۱۷۴۳ء میں اردو کتابیں نسخ ٹائپ میں چھپنے لگیں۔ طباعت مشین سے ہوتی تھی۔ نستعلیق کی دیدہ زیبی اس خط میں مفقود تھی۔

اس بات کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے کہ اردو کی طباعت کا سلسلہ سب سے پہلے ٹائپ نہ کہ لیتھو (پتھر کی طباعت) سے شروع ہوا۔ ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ یعنی نسخ ٹائپ کی ترویج کے تقریباً سو سال بعد لیتھو کی چھپائی کا آغاز ہوا۔ ابتداً یہ طباعت ہاتھ سے ہوتی تھی۔ جہاں تک طباعت کا تعلق ہے لیتھو طباعت نسخ ٹائپ کی طباعت سے ایک قدم آگے نہ تھی۔ بلکہ دو قدم پیچھے تھی۔ لیکن اردو والوں نے اس طریقۂ طباعت کا اس لئے خیر مقدم کیا کہ اس میں نستعلیق رسمِ خط میں اردو کتابیں چھپنے لگیں جو ٹائپ سے خطِ نسخ

میں چھپنے والی کتابوں سے زیادہ مقبول تھیں۔

اب اردو طباعت دوراہے پر تھی۔ طباعت کی سہولت ٹائپ میں تھی۔ دیدہ زیبی اور خوبصورتی نستعلیق میں۔ لیتھو طباعت کو رواج تو مل گیا۔ لیکن اس کی کوتاہیوں کو ہمیشہ محسوس کیا گیا۔

ابتدا ہی سے اس امر کی کوشش کی گئی کہ ٹائپ نسخ کی بجائے نستعلیق میں ہوتا کہ اردو رسم خط کا حسن بھی باقی رہے اور طباعت کے عصری طریقوں سے استفادہ بھی کیا جا سکے۔ لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تھی۔ حیدر آباد بھی ان کوششوں میں پیش پیش تھا۔ بڑی جستجو کے بعد حیدر آباد میں ۱۹۳۰ء میں نستعلیق ٹائپ ایجاد ہوا۔ یہ فنی لحاظ سے بڑا کامیاب تجربہ تھا۔ لیکن تجربہ کی حد سے آگے بڑھ کر عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ کیونکہ تجارتی نقطۂ نظر سے نستعلیق ٹائپ کی کمپوزنگ نہایت گراں تھی۔ خود جامعہ عثمانیہ کی سینکڑوں مطبوعات میں ایک کتاب بھی ٹائپ میں نہیں چھپ سکی۔ اور جب حکومتِ حیدر آباد نے ۲۹ جولائی ۱۹۴۰ء کے جریدہ (گزٹ) میں حسب ذیل الفاظ میں اعتراف کیا کہ

"سرکارِ عالی کو اس امر کا افسوس ہے کہ تجارتی نقطۂ نظر سے نستعلیق ٹائپ کامیاب نہیں ہوا۔"

تو پھر موزوں اور کامیاب نستعلیق ٹائپ کی توقعات گویا ختم ہوگئیں۔ اس کے بعد بھی کوششوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن نستعلیق کی نزاکتوں، اس کے نوک پلک اور بعض حرفوں کی بیٹھک کی وجہ سے باوجود انتہائی کاوش کے نستعلیق ٹائپ حسب دلخواہ مکمل نہیں ہوا۔ جتنی کوششیں ہوئیں ان سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ نستعلیق رسم خط کی انفرادیت کی وجہ سے حروف ملا کر شکلیں بنانا ممکن نہیں کیونکہ ان مختلف شکلوں یا ترسیموں کی تعداد بیس ہزار سے کم نہیں۔ گویا نستعلیق ٹائپ بیس ہزار کیسے کی بورڈ پر مشتمل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسا ٹائپ کبھی بھی عملی جامہ نہیں پہن سکتا۔

دوررس نگاہوں نے اس خامی کو محسوس کیا۔ جناب سجاد مرزا نے اپنے مقالہ "اردو رسم خط" ۱۹۴۰ء میں لکھا۔ "اردو کی اہمیت کے مدنظر جو لوگ اس کی ترویج و ترقی میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے بعض اصلاحی مسائل پیش ہیں۔ ان میں سب سے اہم رسم خط اور ٹائپ کی طباعت کے مسائل ہیں۔"

پروفیسر ہارون خاں شروانی نے ۱۹۵۷ء میں اپنے مقالہ " اردو رسم خط " میں لکھا

" یہ تو اردو کے لئے گویا سزائے موت کا پروانہ ہوگا کہ ہم اس کے چھاپے میں ادنیٰ درجہ کے لیتھو کے پیچھے پڑے رہیں۔ یہ تو ایسی بات ہوئی کہ جہاں ہم ہوائی جہاز، یا ریل میں جا سکتے ہوں۔ وہاں بیل گاڑی میں جانے کو ترجیح دیں۔ اگر ہم اردو زبان کی بقا چاہتے ہیں تو ہمیں لیتھو کو یک قلم ترک کرنا ہوگا "

پروفیسر ہارون خاں شروانی لیتھو طباعت کے سخت مخالف تھے۔ حیدرآباد کے روزنامہ سیاست کو کوئی مضمون اشاعت کے لئے دیتے تو یہ شرط عائد کرتے کہ طباعت ٹائپ میں ہو۔ چنانچہ جس دن ان کا مضمون شائع ہوتا تو سیاست کا وہ حصہ ٹائپ میں شائع ہوتا۔

اس کے بعد ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ برِ صغیر میں فوٹو آفسٹ کے ذریعہ طباعت کا رواج عام ہوا۔ لیتھو کے بعد یہ تبدیلی بھی نستعلیق کے حق میں تھی۔ اس میں کتابت کا طریقہ بدستور باقی رہا۔ طباعت کے طریقہ میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ لیتھو میں دو چار ہزار سے زائد طباعت کی صورت میں دشواریاں پیدا ہوتی تھیں۔ فوٹو آفسیٹ کے تحت لاکھوں کی طباعت ممکن ہوئی۔ طباعت کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ کتابت کی رفتار طباعت کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کے قابل نہ تھی۔

فوٹو آفسیٹ کی ترویج کے بعد نستعلیق کی کتابت میں ترقی کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہونے لگی نستعلیق کو کاتب کے ہاتھ سے نکال کر مشین کمپوزنگ پر لانا بھی ناممکن ثابت ہو چکا تھا۔ یہ بڑا اہم مسئلہ تھا جس کو حل کئے بغیر اردو کتابت اور طباعت کا مستقبل اور خود زبان کا مستقبل غیر یقینی تھا۔ مسابقت کے دور میں یہ مسئلہ زیادہ سنجیدگی کا مستحق تھا اور نستعلیق کے بیس ہزار ترسیمے ایک بڑی رکاوٹ تھے۔

اس نوبت پر کمپیوٹر نے اردو کتابت کی مشکل کو حل کیا۔ کمپیوٹر میں معلومات یا کارآمد مواد " کا جو بھی ذخیرہ محفوظ کر دیا جائے، بوقت ضرورت ذرا سے اشارے پر اس کے انفرادی اجزا سامنے آسکتے ہیں اور ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔

کمپیوٹر کی اس صلاحیت سے طباعت میں بھی فائدہ اٹھایا جانے لگا۔ اسی دوران لیزر شعاعوں کا عکس اتارنے کی بجائے پوری عبارت کی نہایت تیزی کے ساتھ تصویر اتاری جانے لگی اور سطریں بھی

مرتب کی جانے لگیں۔ ان ایجادات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انکواردو کی طباعت کے لئے استعمال کرنے کا بیش قیمت خیال رنگین طباعت کے ماہر جناب احمد مرزا جمیل اور ان کے ساتھی جناب مطلوب الحسن سید کے لئے مقسوم تھا۔ ان ہر دو خوش قسمت حضرات نے یہ محسوس کیا کہ نستعلیق کے بیس ہزار ترسیموں کی کتابت کی جائے اور اس ذخیرہ کو کمپیوٹر کے ذہن میں محفوظ کر دیا جائے اسی طرح خط نستعلیق میں بھی فلم تیار ہو سکتی ہے۔ احمد مرزا جمیل نے نہ صرف خود اعتمادی اور قوتِ ارادی سے فنی اور ٹیکنیکل مسائل کو حل کیا بلکہ نہایت کم عرصہ میں سولہ ہزار ترسیموں کی کتابت بھی کلیتہً خود کی۔ ظاہر ہے کہ یہ نہایت محنت طلب اور صبر آزما کام تھا۔

اس کمپیوٹر میں جو لیزر کامپ کہلاتا ہے حروف کے جوڑ ملا کر الفاظ نہیں بنائے جاتے بلکہ الفاظ یا الفاظ کے ٹکڑے مرتب کر کے عبارت بنائی جاتی ہے۔ اس جدید عمل میں اردو کے تمام الفاظ (مثلاً لکھنا، سیکھنا، علم، قلم وغیرہ) یا الفاظ کے اجزاء مثلاً (جانا کے اجزاء، جا اور نا) کتابت شدہ صورت میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ جب تربیت یافتہ آدمی عبارت سامنے رکھ کر ٹائپ کرنا شروع کرتا ہے تو یہ اشارے مقناطیسی ریکارڈ پر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ بعد میں لیزر کامپ مشین کا الیکٹرانک کمپیوٹر سسٹم اور اس کی لیزر شعاعیں بیک وقت اپنا حیرت انگیز کام انتہائی تیزی کے ساتھ شروع کر دیتی ہیں۔ کمپیوٹر کا "حافظہ" محفوظ شدہ الفاظ کے ترسیموں کے ذخیرے سے مطلوبہ لفظ یا اس کے اجزاء تلاش کر کے بڑی تیزی سے عبارت مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔

الیکٹرانک شعاعوں کی رفتار فی ثانیہ کئی لاکھ برقی اشاروں سے بھی زیادہ ہے اس قدر تیزی سے حرکت کا تصور بھی دشوار ہے۔ ٹائپ کا عمل اور اس کے نتیجہ میں کتابت شدہ عبارت تو سامنے آجاتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کیونکر ہوتا ہے۔ ذہنِ انسانی اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس مشین کے ذریعہ فی الحال دس پائنٹ سے لے کر چوبیس پائنٹ تک کی کتابت کی جا سکتی ہے۔ مشین ہدایت کے عین مطابق تعمیل کرتی ہے۔ جس میں عبارت کا جلی یا خفی ہونا، کالم کی چوڑائی، تصویر وغیرہ کے لئے جگہ خالی چھوڑنا شامل ہیں۔ کتابت شدہ عبارت کی تصحیح مضمون کی کانٹ چھانٹ با آسانی ہو سکتی ہے۔ اعلیٰ صلاحیت

کے حامل احمد مرزا جمیل نے برطانیہ کے مونو ٹائپ کارپوریشن کے فنی تعاون سے اردو طباعت کے ایک بہت بڑے خلا کو پُر کیا اور خطِ نستعلیق میں کمپوزنگ کی راہ میں جو فنی اور عملی مشکلات حائل تھیں انکو دور کیا ہے۔

جب یکم اکتوبر ۱۹۸۱ء سے روزنامہ اخبار جنگ میں اور نومبر ۱۹۸۱ء میں انٹرمیڈیٹ کلاسوں کے لئے اسلامیات (لازمی) کی نصابی کتاب میں برقی کتابت کو اختیار کیا گیا تو گویا نستعلیق کی قدیم روایت اور جدید ٹیکنالوجی کا حسین امتزاج ہوا۔ اور اس طرح اردو زبان کا مستقبل درخشاں ہو گیا۔

احمد مرزا جمیل پاکستان ایسوسی ایشن آف پرنٹنگ اینڈ گرافک آرٹس انڈسٹری کے صدر نشین ہیں۔ عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہے۔ چہرے سے وجاہت اور ذہانت عیاں ہے۔ شخصیت سے اعتماد اور عزم کا اظہار ہوتا ہے۔ گذشتہ ہفتہ ملاقات کے دوران انہوں نے مجھے بتایا کہ برقی کتابت کو انکے والد مرحوم مرزا نور احمد کے نام پر نوری نستعلیق سے موسوم کیا گیا ہے۔ مجھے یہ نام موزوں معلوم ہوا۔ لفظ نوری کو الیکٹرانکس کا مترادف بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

"نوری نستعلیق" خطِ نستعلیق کا ارتقاء نہیں بلکہ کتابت کے طریقہ کا ارتقاء ہے۔ کتابت ہاتھ سے کی جاتی تھی، مشینوں کے ذریعے کتابت (کمپوزنگ) کا دور آیا تو خطِ نستعلیق اس کے لئے غیر موزوں ثابت ہوا اور مجبوراً خطِ نسخ کا سہارا لینا پڑا۔ دھات کے حروف کے ٹکڑوں کو جوڑ کر لفظ ترتیب پاتا تھا۔ مشین کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے حروف کو توڑا موڑا جاتا تھا۔ اور یہ ناگزیر تھا۔

خطِ نستعلیق کی نزاکت مشین کی ضرورت کی تاب نہ لا سکتی تھی چنانچہ اس وقت تک اردو طباعت کے لئے ہاتھ سے لکھی جانے والی خطاطی پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اب نوری نستعلیق کی وجہ سے اردو ایک ہی جست میں بین الاقوامی زبانوں کی صف میں آ گئی، جن میں طباعت کے جدید طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔

ستمبر ۱۹۸۲ء

حسن الدین احمد: ہندوستان کے ممتاز سول سرونٹ، شماریات سے تعلق رہا اور اسی تعلق کو لسانی تحقیق کی بنیاد بنایا، حیدرآباد دکن میں مقیم ہیں۔

عظمت عزمی

قومی ترقی میں نوری نستعلیق کا کردار

لحظہ بلحظہ، دم بدم زندگی کا سفر جاری و ساری ہے۔ ایک لمحے ایک ساعت کے لئے زندگی کہیں تھم کر نہیں بیٹھتی، ڈھونڈھنے، تلاش کرنے اور کچھ پانے کا جذبہ افراد بلکہ اقوام کو بھی حیاتِ جاودانی بخش دیتا ہے۔ وہی قومیں زندگی کے سفر میں کامیاب اور کامران قرار دی گئی ہیں، جو مسلسل محنت اور انتھک کوششوں سے نئی راہیں، نئے راستے، نئی جہتیں پیدا کرتی رہی ہیں۔ پاکستان کی کہانی بھی ایک مسلسل سفر، ایک لگاتار تگ ودو کی کہانی ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت، پاکستان، صنعت وحرفت کے معاملے میں انتہائی کسمپرسی کا شکار تھا۔ کارخانے نہ ہونے کی وجہ سے صنعت کم اور دگرگوں حالت میں تھی۔ لیکن ان پینتیس ۳۵ برسوں میں صنعت وحرفت، زراعت اور آبپاشی، پارچہ جاتی اور قالین سازی سے لے کر فولادسازی تک پاکستان نے زندگی کے ہر شعبے میں تیزی سے ارتقا کی منازل طے کی ہیں

لیکن ان تمام شعبوں کے علاوہ پاکستان میں ایک شعبہ ایسا بھی تھا جو پینتیس برس گزرجانے کے باوجود بھی اسی مقام پر اور اُسی حال میں تھا جیسا کہ قیامِ پاکستان کے وقت اس کی حالت زار تھی۔ وہ شعبہ اردو کتابت اور طباعت کا ہے۔ حالانکہ پاکستان میں رنگین چھپائی اور پیکجنگ کی صنعت نے قابلِ قدر ترقی کی ہے۔

اردو طباعت کی ترقی میں ہاتھ کی کتابت کی آہستہ روی ہمیشہ رکاوٹ بنی رہی، کیونکہ کتابت اور طباعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اردو کتابت کی ترقی، اردو طباعت میں ترقی لازم وملزوم ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اردو طباعتی صنعت اس مشینی دور سے بہت پیچھے زمانۂ وسطیٰ کی سطح پر قائم ہے، پاکستان میں بھی ہاتھ کی کتابت کی حیثیت گھریلو صنعت کی سی ہے

جبکہ دیگر ممالک نے جدید دور کی جدید ترین مشینوں کو بروئے کار لاکر الیکٹرانک ٹائپ کاری کے ذریعے طباعتی صنعت کو انتہائی رفتار اور ترقی یافتہ صورت عطا کردی ہے، صد شکر کہ پاکستان میں پچھلے دنوں اس امر پر توجہ کی گئی اور دُنیائے طباعت کی ایک معروف ہستی جناب احمد مرزا جمیل، چیئرمین ایلیٹ پبلشرز اور انکے ساتھی مطلوب الحسن سیّد نے اس مسئلہ پر نہ صرف سنجیدگی سے غور کیا بلکہ نوری نستعلیق کی ایجاد کرکے اردو طباعت کو پتھر اور لیتھو کے دور سے نکال کر کمپیوٹر کے زمانے تک پہنچا دیا ہے، بقول ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے

"نوری نستعلیق کی ایجاد نے اردو کتابت کو اس عہد کی رفتار دی ہے"۔

اور یہ حقیقت ہے کہ نوری نستعلیق کی ایجاد نے قومی ترقی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ قومی زبان اردو کو ایک مسلسل شرمندگی سے نجات دلاکر ایک ہی جست میں دُنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بشانہ لاکھڑا کیا ہے۔ نوری نستعلیق کی ایجاد سے پہلے ہم اردو طباعت کے شعبے میں مستقل پسماندگی کا شکار تھے۔ اور یہ پسماندگی قومی زبان کی ترقی نیز بالواسطہ قومی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی تھی، کتابت کی سست رفتاری کی وجہ سے طباعت کی صنعت پسماندگی کا شکار تھی جدید ترین علمی اور صنعتی معلومات قومی زبان اردو میں نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا اشاعتی اور وابستہ صنعت طبقہ ترقی اور تجربے کی دوڑ میں مغرب سے بہت پیچھے رہ گیا۔

اگر ایک خاص اور محدود طبقہ، مغربی زبانوں سے آشنائی کی بناء پر ان جدید معلومات سے آگاہ بھی ہوجاتا تو وہ پاکستان میں رائج قدیم طریقۂ طباعت کی وجہ سے ان معلومات کو قومی زبان میں عوام تک بروقت نہیں پہنچا سکتا۔

کبھی کبھی کوئی دانشور یا علم دوست ان جدید سائنسی معلومات کو اردو میں منتقل کرکے چھاپنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو وہ معلومات عوام تک پہنچتے پہنچتے اتنی پرانی ہوجاتی ہیں کہ ان کی افادیت ہی ختم ہوجاتی ہے۔

اردو کی ضخیم تصانیف کی طباعت کو کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو طابع اور ناشر ایک طویل مدت کے لئے، خصوصاً کاغذ کے اخراجات کی صورت میں، اپنا سرمایہ پھنسانے کے لئے تیار

نہیں ہوتے، کیونکہ ہزار پانچ سو صفحات کی کتابت کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ اور کتابت کے آغاز کے وقت کتاب کی قیمت کا جو تخمینہ لگایا جاتا ہے وہ کتابت کے مکمل ہونے پر بڑھ چکا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس عرصے میں نہ صرف کاغذ کی قیمت میں اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔ بلکہ طباعت کے نرخ بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور یوں کتابت کی وجہ سے کتاب بھی بر وقت شائع نہیں ہو پاتی۔ اور اپنے طابع اور ناشر کے لئے کاروباری لحاظ سے نقصان کے اندیشے کا باعث بن جاتی ہے یا منافع لے ڈوبتی ہے

کتنے ہی نابغہ ذہن، کتنے ہی جواہر پارے، کتابت کی آسانی نہ ہونے کی بنا پر قومی ترقی کی دوڑ میں شامل ہو سکے نہ عوام الناس میں مقبولیت حاصل کر سکے، اور اگر کچھ شوریدہ سر کمر بستہ ہوئے بھی تو انہیں بے پناہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کاتبوں کے گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر، ان کے پیچھے بھاگ کر مصنف کا حوصلہ پست اور شوق ماند پڑ جاتا ہے۔ بقول شخصے 'مصنف کا وزن کتاب چھپوانے سے پہلے کچھ اور ہوتا ہے اور کتاب چھپنے کے بعد کچھ اور ہو جاتا ہے۔

اِن مشکلات کے بارے میں پہلے بھی کئی بار سوچا گیا اور کئی اقدامات بھی کئے گئے۔ خاص طور پر انگریزوں نے اٹھارویں صدی کے وسط میں اردو طباعت کے مروجہ طریقہ کو تیزی عطا کرنے کے لئے، اردو زبان کا ابتدائی ٹائپ بنانے کی کوشش کی تھی۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۰ء تک فورٹ ولیم کالج کے مطبع میں اردو کتابیں نیم نستعلیق ٹائپ میں چھاپنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۸۲۵ء میں والئ اودھ نواب غازی الدین حیدر نے انگریز کی نگرانی میں ٹائپ کا چھاپہ خانہ قائم کیا۔ جہاں سے ایک فارسی لغت "ہفت قلزم" کئی جلدوں میں نسخ ٹائپ میں چھپی۔ لیکن یہ سب کتابیں نستعلیق رسم الخط میں نہ ہونے کی وجہ سے عوام میں مقبولیت حاصل نہ کر سکیں، اس کے بعد سر سید احمد خان نے اپنی ذاتی کوششوں سے تقریباً سو سال قبل ریاستی سطح پر غازی پور (یوپی) میں ایک مطبع قائم کیا۔ اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ایک خاص قسم کے خط میں ایک نستعلیق ٹائپ بنوایا۔ لیکن یہ دونوں ٹائپ روایتی خطِ نستعلیق کی نزاکت اور جمالیاتی معیار پر پورے نہ اترے، اس لئے اردو داں طبقہ تا دیر ان کی پذیرائی نہ کر سکا۔ قیام پاکستان کے بعد، ۱۹۴۸ء میں اردو پڑھنے

اردو پسند کرنے والے طبقے میں ٹائپ کی چھپائی کو مقبول بنانے کی ایک اور کوشش کی گئی۔ روزنامہ ڈان اردو جاری کیا گیا، جو تقریباً نسخ ٹائپ میں چھپتا تھا۔ لیکن یہ بھی چند سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ اس کے بعد روزنامہ جنگ نے ۱۹۶۱ء میں کچھ حصہ فوٹو ٹائپ میں شائع کرنا شروع کیا لیکن اُسے بھی سندِ قبولیت نہ حاصل ہو سکی۔

ان تمام کوششوں کے ناکام ہو جانے کی حقیقی وجہ اردو خواں طبقے کی نستعلیق سے والہانہ محبت اور انسیت تھی۔ اس طبقے کا جمالیاتی ذوق ٹائپ کے حروف کو، ٹائپ کی طباعت کو قبول کرنے سے منکر تھا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ خطِ نستعلیق اور خوشنویسی کی ترقی، تحفظ اور ترویج کے لئے مثبت اقدامات کئے جاتے، کیونکہ کتابت کی صنعت بھی مشینی دور کی تیز طلبی سے متاثر ہو رہی تھی۔ خطاطی کا جو ورثہ قومی سطح پر کئی صدیوں کی کاوش اور مسلسل ریاض کے بعد تشکیل پایا تھا وہ پچھلی چند دہائیوں میں اس مشینی دور کی برق رفتاری اور بڑھتی ہوئی طلب کی وجہ سے نو مشق کاتبوں کے ہاتھوں روایتی حسن کھو رہا تھا۔ کیونکہ کئی نسلوں سے جو خاندان خطاطی و کتابت کے پیشہ سے وابستہ چلے آرہے ہیں انکی نوجوان نسل نے کتابت کی دیدہ ریزی اور عرق فشانی کو قبول نہیں کیا اور دوسرے پیشے اختیار کر لئے۔ اسطرح فنِ کتابت کا قومی ورثہ جو قومی سطح پر کئی صدیوں کے بعد اپنی ایک تاریخ اور اپنی ایک حیثیت بنا چکا تھا دن بدن غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

یہ تمام حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ خطِ نستعلیق کو اس کے حسن اور جمالیاتی کیف کے ساتھ اس مشینی دور کی تیز رفتاری کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ اور اس شدید ضرورت کو نوری نستعلیق کی ایجاد نے احسن طریقے سے پورا کر دیا۔ اگر نوری نستعلیق کی مختصر ترین الفاظ میں تعریف کی جائے تو کہا جائے گا، نوری نستعلیق یعنی کمپیوٹر سے کتابت۔ نوری نستعلیق کے موجد، احمد مرزا جمیل (تمغۂ امتیاز) نے الیکٹرانک اصولوں سے کام لے کر نستعلیق کے روایتی حسن، بانکپن اور اندازِ خاص کو جو صرف ہاتھ کی کتابت سے حاصل ہوتا رہا ہے، بڑی کامیابی کے ساتھ کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا ہے اور ان کے اس تاریخی کارنامے کو نہ صرف اردو نواز طبقوں نے سراہا اور بے حد پسند کیا بلکہ سرکاری طور پر بھی نوری نستعلیق کی ایجاد کو قومی اہمیت کی ایجاد قرار دے کر صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے احمد مرزا

جمیل کو تمغۂ امتیاز سے نوازا ہے، اور اُسے سرکاری سطح پر بھی بلاشبہ قومی اہمیت کی ایجاد قرار دیا گیا ہے۔ حکومت پاکستان کی اس اردو نوازی نے اردو خواں طبقے کے نہ صرف دل جیت لئے بلکہ نوری نستعلیق کمپیوٹری مشین کی پہلی دس مشینوں کی درآمدی ڈیوٹی معاف کرنے کا اعلان کر کے صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے اردو کا مستقبل بے حد روشن اور تابناک بنا دیا ہے۔

نوری نستعلیق کی ایجاد نے الفاظ کی روایتی، معیاری اور دلکش شکلوں کو ہمیشہ کے لئے متعین اور محفوظ کر لیا ہے۔ پوری تحریر اوّل سے آخر تک ایک ہی قلم سے لکھی ہوئی نظر آتی ہے، جس کا بیّن ثبوت روزنامہ جنگ (لاہور) ہے، جس کی کتابت نوری نستعلیق میں ہوتی ہے۔ اور جس کا اجراء طباعت کی تاریخ میں یادگار حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ نوری نستعلیق کی ایجاد نے پاپیادہ چلنے والی اردو طباعت کو پر پرواز عطا کر دئیے ہیں اور ایک لمحے میں پاکستان کی طباعتی صنعت کو دوسری قومی صنعتوں کے شانہ بہ شانہ لا کھڑا کیا ہے۔ جس کا واضح اور مثبت اثر قومی ترقی پر محسوس کیا جا سکے گا۔

بطورِ خاص تعلیم کا شعبہ نوری نستعلیق کی وجہ سے ایک زرّیں دور میں داخل ہو جائے گا۔ طالب علموں کے لئے نصاب کے مطابق کتابیں فوری طور پر دستیاب ہوں گی، کیونکہ نوری نستعلیق کمپیوٹر پر چند آپریٹروں کی مدد سے ۳۰۰ صفحات کی کتابت ایک یا دو دن میں مکمل کی جا سکتی ہے۔ نیز نوری نستعلیق کی وجہ سے الفاظ کی یکسانیت، طالب علموں کے طرزِ تحریر پر خوشگوار اثرات مرتب کرے گی۔ کیونکہ عموماً کاتب کام کی زیادتی کی وجہ سے زود نویسی اور بدخطی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اب طالب علم مختلف مضامین کی کتابوں میں کتابت کے مختلف تجربے دیکھ کر الجھن میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ انہیں نہ صرف دقیانوسی انداز کی کتابت سے نجات مل جائے گی۔ بلکہ نوری نستعلیق، کتابیں طالب علموں کو ارزاں قیمت پر دستیاب ہوں گی۔ کیونکہ نسخ کے مقابلے میں نوری نستعلیق کی کتابت ۴۰ فیصد کم جگہ گھیرتی ہے اور ہاتھ کی کتابت کے مقابلے میں ۲۰ تا ۳۰ فی صد کم جگہ لیتی ہے۔ یوں کاغذ کی بچت ضخامت میں کمی کا باعث بن کر کتاب کی قیمت میں نمایاں کمی کر دیتی ہے۔

نوری نستعلیق کی ایجاد علم و خبر کی دُنیا میں انقلاب لے آئی ہے۔ خاص طور پر اخبارات کے

لئے نوری نستعلیق نوید نو ثابت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے آخری لمحے تک آنے والی خبروں کو اخبار میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ بلکہ کم جگہ میں زیادہ خبریں شائع کی جاسکتی ہیں۔ دراصل اس عہد آفریں ایجاد نے اردو اخباروں کو عہد پسماندگی سے نکال کر دورِ نو میں شامل کر دیا ہے۔ ایک مغربی سیاح نے جنوبی ایشیا کا سفر کرنے کے بعد اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ اگر آپ کو نوادرات جمع کرنے کا شوق ہے تو آپ پاکستان کا ایک اردو اخبار ضرور خرید لیجئے، جہاں آج بھی اخبارات روزانہ ہاتھ سے لکھ کر شائع کئے جاتے ہیں۔ صد شکر نوری نستعلیق نے اردو اخبارات کو مغربی اخبارات کے شانہ بہ شانہ لا کھڑا کیا۔ اب وہ دن دور نہیں کہ جب بچے حیرانی سے پوچھا کریں گے کیا بیسویں صدی کے آخر تک ہمارے یہاں اخبارات روزانہ ہاتھ سے لکھ کر چھاپے جاتے تھے؟

نوری نستعلیق کی ایجاد کا ایک فیضان یہ بھی ہے کہ اس نے اچھے کاتبوں کی کمی کا مسئلہ حل کر دیا۔ ہم با آسانی آج کے عہد کے قومی، علمی و ادبی ذخیرے کو کتابی شکل دیکر حیاتِ جاوداں بخش سکتے ہیں۔ اور یوں آنیوالی نسلیں ہماری ممنونِ احسان رہیں گی کہ ہم نے ادبی، تحقیقی، سائنسی اور تکنیکی میدان میں مزید ترقی اور تجربے کے لئے انہیں ٹھوس بنیادیں فراہم کر دیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ نوری نستعلیق کی وجہ ہی سے یہ ممکن ہوا ہے کہ اپنے عہد اور آنیوالے عہد کی خوشنویسی کے مختلف نمونوں کو محفوظ کیا جاسکے اور انہیں عوام کے سامنے پیش کیا جاسکے۔

آج کا دور جیٹ انداز اور برق رفتار دور ہے۔ ہر نفس یہاں کام کی زیادتی اور وقت کی کمی کا شکار ہے تو ان حالات میں ایک اچھے کاتب کی تیاری کے لئے پانچ سال انتظار بہت گراں بھی گزرتا ہے اور نئی نسل اس مشقت کے لئے آمادہ بھی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس نوری نستعلیق مشین کے آپریٹر کی تربیت میں صرف چھ ہفتے صرف ہوتے ہیں۔ اس لئے موخر الذکر شعبہ ہمارے لئے سودمند بھی ہے۔ اور تیز رفتار بھی۔

مختصر یہ کہ نوری نستعلیق کی عہد آفریں ایجاد قومی ترقی کا ایک خوش آئند باب ہے۔ جس میں خوشبوؤں کی امیدوں کی بے شمار کرنیں پھوٹتی دکھائی دے رہی ہیں۔

ایک شاعر

تسلیم کوثر
سیّد ابوالخیر کشفی

ابو الخیر کشفی

ایک شاعر، ایک آدمی

شہر بڑھتے ہیں تو ایک طرف ہوا کی تازگی، افق کے پھیلاؤ اور ہریالی کو کھا جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف انسان سے اس کی معصومیت، روح کی وسعت اور تازہ خیالی چھین لیتے ہیں۔ ان دونوں مثالوں میں لف و نشر مرتب ہے۔ یعنی

ہوا کی تازگی / انسانی معصومیت

افق کا پھیلاؤ / روح کی وسعت

ہریالی / تازہ خیالی

یہ فطرت اور انسان کی مساوات کا سوال ہے اور شاید سائنسی عہد میں تنقید انہیں فارمولوں میں ڈھل جائے۔

مگر کچھ لوگ مدافعت کرتے رہتے ہیں۔ سلیم کوثر بھی وہ لڑکا ہے جو اپنے گمان میں تتلیوں کا تعاقب کرتے کرتے کراچی پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تتلیاں تندور کی آدھی جلی ہوئی روٹیوں میں بدل گئی ہیں ـــــ اور اس لمحے سلیم خواب سے جاگا اور اس کی مدافعت و مزاحمت کا وہ دور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے اور شاید یوں ہی جاری رہے گا۔ "شاید" کا لفظ میں نے احتیاطاً استعمال کیا ہے ورنہ مجھے اپنی دعاؤں کے اثر اور سلیم کی نجابت پر پورا یقین ہے۔

سلیم کوثر کی زندگی اور اس کی غزل دونوں اسی مزاحمت کی دستاویزیں ہیں اس نے کراچی کے تلب کے ہنگاموں کی جگہ مضافاتی بستی کو اپنا رین بسیرا بنایا ہے اور جب

صبح اس کی آنکھ کھلتی ہے تو اس کے صحن میں بکری کی "میں میں" سنائی دیتی ہے، منڈیر پر کبوتروں کی اور چڑیوں کی قطاریں اور کاگا بولتا ہے اور درختوں کے سائے سے دھوپ چھن چھن کر آتی ہے۔ سلیم ڈرتے ڈرتے شہر کی حدود میں داخل ہوتا ہے اور پھر اپنے دوستوں کے درمیان وقت گزار کر شام کو آوارگی اور گھر کے درمیان بکھر جاتا ہے۔ کراچی میں

ع چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے

کا منظر دکھائی نہ دیتا ہو مگر سلیم نے اس منظر کو انسانی زندگی کی معنویت دے دی ہے میں نے اپنی زندگی بڑے شہروں کے ہنگاموں میں گزاری ہے مگر اب میں بھی مضافاتی شرفا کی فہرست میں شامل ہوں۔ شاید اسی لئے سلیم کبھی کبھی اپنی بستی کا رخ کرنے کی جگہ میری بستی کی طرف آنکلتا ہے۔

سلیم کوثر انسانوں سے مایوس نہیں ہوتا کیونکہ وہ انسانوں سے کچھ مانگتا نہیں، وہ تو قطرہ قطرہ مسرت اور سکون کی طرح زندگی کے کھیتوں پر برستا رہتا ہے۔ بادل برس کر زمین کو شاداب کر دیتے ہیں اور اُن کا دامن خالی ہو جاتا ہے، مگر جب بادل کھیتوں میں خوشوں کا رقص دیکھتا ہے تو اُسے اپنے دامانِ تہی کا صلہ مل جاتا ہے۔ سلیم کوثر کی شاعری اس کی زندگی کی طرح قطرہ قطرہ نزولِ بارش ہے۔ کراچی نے اس سے کچھ چھینا نہیں کچھ دیا ضرور ہے۔ اس نے یہاں سمندر کی وسعت دیکھی اور اسے اپنے سینے میں اتار لیا۔ کراچی کی خاک میں اس کی ماں سو رہی ہے۔ ماں، جس کی دعاؤں کے سائبان تلے ہم اس کے بعد بھی اپنے آپ کو بہت ہی محفوظ سمجھتے ہیں۔

یہ تحریر سلیم کی ذات اور شاعری پر تنقید نہیں، یہ محض ایک اعتراف ہے۔ اسے دل چاہے تو CITATION کہہ لیجئے۔ سلیم کوثر کی غزل آج بلوغ کے اس مرحلے تک پہنچ گئی ہے کہ وہ اس کی زندگی کی صورتِ حال کو اپنے پیکر میں سمو لینے کے قابل ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی زندگی کے اس آئینہ خانے میں کوئی ایسی عورت بھی نصیب والوں کو مل جاتی ہے جس کی آنکھوں میں

سوال اور جواب دونوں بیک وقت دکھائی دیتے ہیں۔ سلیم کوثر کی غزل بھی ایسا ہی دوطرفہ عمل ہے۔ وہ زندگی کے بنیادی مسائل کے سوالوں کو اٹھاتا ہے اور پھر اُس کا نفسِ مطمئنہ جواب کی صورت حرفِ غزل میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کی مثال اس کی پہلی غزل ہے۔ ۶

زمیں ہے آسماں ہے اور میں ہوں

کبھی آسمان ہمارا امتحان لیتا تھا، آج زمین بھی امتحان لے رہی ہے، اور اپنے سوالوں کے جواب چاہتی ہے اُس انسان سے جو انہا کے کنارے پر کھڑا ہے اور حصارِ دوستاں کو ایسی پناہ گاہ سمجھتا ہے جو اسے تنہائی کی نعمت عطا کرتا ہے۔ ایک طرف حال کے سنگین حقائق اسکی زندگی کے دروازے پر دستک دیتے ہیں اور وہ درِ آئندگاں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے یہ گریز نہیں ذات کا کمال ہے۔ ذات کو یہ کمال دین سے عطا ہوا ہے اور سلیم نے اس متاع کا اظہار دین کی اصطلاحوں کے حوالے سے کیا ہے ؎

وہی ہے دولتِ بیدارئ شب
وہی جنسِ گراں ہے اور میں ہوں
وہی جائے نمازِ عشق میری
وہی میری اذاں ہے اور میں ہوں

میں "دولتِ بیدارئ شب" کو بھی دینی اصطلاح قرار دیتا ہوں۔ نالۂ نیم شبی' اور آہِ سحر گاہی کے اسرار جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کے سجدوں اور آنسوؤں سے چمکتے تھے انہیں ہم پر اقبال نے فاش کیا اور اقبال کی فنی روایات کا مقلد نہ ہوتے ہوئے بھی سلیم اقبال کی اس معنویت اور عرفان کے وارثوں میں سے ہے۔

سلیم کوثر بیک وقت اس بڑے ساحلی شہر، اس عہد کے تضادات، کائنات اور ذاتی صورتِ حال کی آفاقیت کا شاعر ہے، عشق کے پھیلاؤ کا شاعر ہے۔ اِس اجتماعی حالات کے تحت وہ صورتِ حال کی جگہ صورتِ حالات کی ترکیب استعمال کرتا ہے ؎

اچھا ہے کسی صورتِ حالات میں رہنا

دن شہر میں اور رات مضافات میں رہنا

اِس غزل کے دوسرے شعر نے مجھے اُس رندِ پاک نہاد کی یاد دلائی جو کبھی سراج الدین ظفر کہلاتا تھا اور اب وہ ایک یاد بن کر قلب میں جاگزیں ہے۔

ہر رات ستاروں کو زمیں پہ لئے پھرنا

ہر صبح کہیں حمد و مناجات میں رہنا

سلیم کوثر کی غزل منظر کی جگہ، ایک وسیع منظر نامہ یا سیریَن کی طرح ہے۔ اس منظر نامے میں اس کی ذات کی گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں، وہ دوسروں کے بطون اور روح میں اترتا ہوا نظر آتا ہے۔ اپنے ماحول سے الجھتا اور نبرد آزما دکھائی دیتا ہے۔ ماحول اور سلیم کا رشتہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ وہ اپنے شہر، اپنے ماحول کو صرف اپنی ذات کے حوالے سے نہیں دیکھتا، بلکہ ایک طرف تو ماحول میں فطرت کی قوت کا اظہار اُسے نظر آتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنے فکر اور اپنے اندیشوں میں اپنے نگر کے باسیوں کو شریک بنانا چاہتا ہے کہ یہ بھی ایک عبادت ہے

یہ شہر سمندر کے کنارے پہ ہے آباد

اِس شہر میں رہنا بھی تو اوقات میں رہنا

دوسرے مصرع میں رہنا کے بعد 'بھی' میں کتنے جبر سمٹ آئے ہیں۔ اس کی خواہش تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ خود کسی چھوٹی سی بستی، کسی صحرا کے نخلستان کا رخ کرے اور اپنے پیاروں کو بھی اپنے ساتھ لیتا جائے مگر دیوارِ رزق کو چاٹنا ہمارا مقدر ہے۔ اسی لئے اگر آج کے یاجوج ماجوج اس دیوار کو پھلانگ نہیں سکتے تو اپنی اوقات میں رہ سکتے ہیں۔ اِس دیوارِ رزق کو زنداں بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن سلیم کوثر اسی زنداں میں اپنے شب و روز کا بڑا حصّہ بسر کرتا ہے مگر جب بھی اُسے موقع ملتا ہے تو حلقۂ سادات کا رُخ کرتا ہے۔ یونس حسنی، جمیل نقوی اور اس حلقہ کے سیّدوں کی باہیں اُسے اپنے حصار میں سمیٹ لیتی ہیں۔

ہم اہلِ طریقت کی یہی رسم رہی ہے

زنداں میں یا حلقۂ سادات میں رہنا

ہمارے عہد کا المیہ یہ بھی ہے کہ گھوڑوں اور کتوں کے شجرے تو اہتمام سے مرتب کئے جاتے ہیں مگر انسانوں کے باب میں ہم اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ لیکن یہ تمسخر اوپری اوپری ہے اور کتنے ہی ایسے مرحلے آتے ہیں جب ہم دوسروں کی عظمت کو اجداد کے حوالے سے ناپتے ہیں۔ اور ایسے دعووں کو تسلیم کرتے ہیں ع

پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

یا

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری

پھر سید البشرؐ سے نسبت اگر محبت کی بنیاد بن جائے تو اس پر طنز یہ تبسم کیوں؟ (ویسے بھی حلقۂ سادات کے لئے یہ نسبت ایک بوجھ اور ذمہ داری ہے، من مانی کرنے کا لائسنس نہیں، اعتبار ہے تو تقویٰ کو)

سلیم کوثر کی ان دونوں غزلوں پر میرے ان تاثرات سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ غزل ایک کُل ہوتی ہے۔ غزل کے اشعار مستقل اکائیاں سہی مگر یہ اکائیاں مل کر ایک بڑی وحدت کو جنم دیتی ہے۔ اس "کل اور جز" کے معاملہ میں ترتیب اور تنظیم کو بڑا دخل ہے۔ یہی بات آج کے اچھے غزل گو شعراء کے بارے میں بھی درست ہے۔ پھر آج کا غزل گو شاعر تو فضا کی غزل کہتا ہے۔ بعض غزلوں میں ممکن ہے کہ کوئی معرکہ کا شعر نہ ملے (اچھے شعر ضرور ہوں) مگر پوری غزل مل کر ایک شعر اور ایک کیفیت بن جاتی ہے۔ فراقؔ نے اس رجحان کو بہت نمایاں کر دیا ہے۔

سراج الدین ظفر، ناصر کاظمی، مجید امجد، ابن انشاء، رسا چغتائی، فرید جاوید، عبیداللہ علیم اور سلیم کوثر کی بہت سی غزلیں اسی رجحان کی تصویریں ہیں۔ یہ نام مثال کے طور پر پیش کئے گئے ہیں کیونکہ یہ بات تو عرض کی جا چکی ہے کہ یہ آج کی غزل کا ایک نمایاں اور قوی رجحان ہے۔

سلیم کوثر کی دو غزلوں کے حوالے سے چند باتیں آپکی خدمت میں عرض کر دی گئیں۔ غزلیں آپکے مطالعہ کی منتظر ہیں۔ ان کا تنوع شاعر کی ذات کے پھیلاؤ کا ایک منظر ہے۔ دن

شہر میں اور رات مضافات میں، صبح حمد و مناجات اور راتیں ستاروں کی معیت میں گزارنے والا یہ شاعر، ان سب ہنگاموں سے الگ ہو کر اور ان سب ہنگاموں میں گم ہو کر اُس رُوحِ مطلق سے ہم کناری کا آرزومند ہے جو ہر طرف سے ایک صدا کی مانند گونجتی ہے اور ہمارے وجود کے خلا کو پُر کرتی ہے ۔

ہم اس قدر ہیں مگر اپنی ہی صدا کے اسیر
وہ ایک ہے جو ہمیں چار سو پُکارتا ہے

سلیم کوثر کی نئی غزلوں میں نئی مرصع کاری نظر آتی ہے۔ خواتین کے زیوروں کی مرصع کاری کے نمونوں اور ڈیزائنوں سے زیوروں کے عہد کا تعین کیا جاتا ہے۔ اور فیشنوں کی مراجعت کے باوجود عہد کا نقش ان پر ثبت ہوتا ہے۔ فنونِ لطیفہ (بالخصوص ادب) میں بھی یہ مرصع کاری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آتش نے مدتوں پہلے اس حقیقت کا بھرپور اظہار کیا ہے ۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

فیض احمد فیض کے مجموعۂ کلام "نقشِ فریادی" پر تنقید کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ آتش کا یہ قول صرف شاعری نہیں بلکہ تنقید کی حقیقت ہے۔ شاعر، رنگ، نغمہ اور آہنگ کے نگینوں سے شعر کے زیور تیار کرتا ہے SANTAYANA نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ شاعر بنیادی طور پر لفظوں میں مرصع کاری کرتا ہے۔ وہ الفاظ کی آوازوں کی حسّی خصوصیات کو اپنے آپ میں محسوس کرتا ہے اور اپنے قاری کی توجہ انہیں حسّی خصوصیات کی طرف مرکوز کراتا ہے۔

سلیم کی ایک بالکل تازہ غزل کا مطالعہ اسی پہلو سے کیجئے ۔

حیرت زدیدۂ حلقۂ خوشبو سے اٹھا
میں اجالے سے اٹھا یا ترے پہلو سے اٹھا

صبح آغاز تری جنبشِ مژگاں سے ہوئی

لشکرِ شام ترے خیمۂ ابرو سے اٹھا

میں کہ زندانیٔ شب تھا یہ گجر بجتے ہی!

کیسا خورشید بکف حجلۂ گیسو سے اٹھا

لفظوں کا یہ مرصع کار لفظوں کی حسی خصوصیات کو اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے مگر اس کے فن کا حسی اور لمسی پہلو بھی تہذیبِ ذات کا آئینہ دار ہے۔ "حجلۂ گیسو" سے خورشید بکف اٹھنے کا ٹھیٹ جنسی جذبہ اور تجربہ کس طرح ترفع کے عمل سے گزرا ہے اور جسم نے کس طرح روح کی سطح تک سفر کیا ہے۔ اس کے سوا " پہ " کے سوتے لفظ کے ماتھے پر بوسہ دیکر سلیم کوثر نے اسے کسی کہانی کی اس سوئی ہوئی شہزادی کی طرح بیدار کر دیا جس کی بیداری کسی شہزادے کے بوسے کی منتظر تھی (یہ بات میں نے میرامن کے اسلوب کے بارے میں لکھی تھی)

سلیم کوثر کو ابھی زبان کے بارے میں مزید احتیاط برتنے کا فن سیکھنا ہے رشید احمد صدیقی نے فیض کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ زبان کے بارے میں اس درجہ احتیاط نہیں برتتے جس کا خود انکی شاعری تقاضا کرتی ہے۔ میں گریۂ نیم شبی کی جگہ، گوہرِ نیم شبی لکھتا، کیونکہ گریۂ نیم شبی، رات کی فضا کو دل کی دھڑکن بنا دیتا ہے اور آنسو میں بدل کر دستِ دعا تک سفر کرتا ہے۔

سلیم کوثر کا سفر جاری ہے۔ وہ پُردم ہے اور ہمتِ سفرِ ہفت خواں کے ساتھ ساتھ زادِ راہ بھی رکھتا ہے۔ خدا اس کے سفر کو جاری رکھے۔ آمین!

تسلیم کوثر

زمیں ہے، آسماں ہے، اور میں ہوں
مسلسل امتحاں ہے اور میں ہوں

کنارے پر کھڑا ہوں انتہا کے
حدودِ لامکاں ہے اور میں ہوں

در و دیوار کی ہمسائیگی میں
مرا اک رازداں ہے اور میں ہوں

اسے کہتے ہیں تنہائی کی نعمت
حصارِ دوستاں ہے اور میں ہوں

مسلسل دستکیں ہیں اور تو ہے
درِ آئندگاں ہے اور میں ہوں

نئی بادِ سبک رفتار موجیں
پرانا بادباں ہے اور میں ہوں

ترے بارے میں جتنا جانتا تھا
وہی میرا بیاں ہے اور میں ہوں

وہی تبدیلئ آب و ہوا ہے
وہی سود و زیاں ہے اور میں ہوں

وہی ہے دولتِ بیدارئ شب
وہی جنسِ گراں ہے اور میں ہوں

وہی جائے نمازِ عشق میری
وہی میری اذاں ہے اور میں ہوں

وہی رستوں کی ناہمواریاں ہیں
وہی سنگِ گراں ہے اور میں ہوں

وہی دن رات کا دورانیہ ہے
وہی کارِ جہاں ہے اور میں ہوں

نہ جانے کون تھک جائے گا پہلے
مری عمرِ رواں ہے اور میں ہوں

تسلیم اک چھاؤں جو زیرِ زمیں ہے
وہ میرا سائباں ہے اور میں ہوں

اچھا ہے اسی صورتِ حالات میں رہنا
دن شہر میں اور رات مضافات میں رہنا

ہر رات ستاروں کو زمیں پر لئے پھرنا
ہر صبح کہیں حمد و مناجات میں رہنا

اس بھیڑ میں گردِ در و دیوار ہے اتنی
ممکن ہی نہیں ہاتھ کسی ہات میں رہنا

اُس شخص کی چاہت بھی عجب ہے کہ ہمیشہ
خاطر میں نہ لانا تو مدارات میں رہنا

یہ شہر سمندر کے کنارے پہ ہے آباد
اس شہر میں رہنا بھی تو اوقات میں رہنا

ہم اہلِ طریقت کی یہی رسم رہی ہے
زندان میں یا حلقۂ سادات میں رہنا

دُکھنا تو سلیم اپنے رویّے ہی پہ دُکھنا
خوش رہنا تو اپنی ہی کسی بات میں رہنا

حیرتِ دید لئے حلقۂ خوشبو سے اُٹھا
میں اُجالے سے اُٹھایا ترے پہلو سے اُٹھا

صبح آغاز تری جنبشِ مژگاں سے ہوئی
لشکرِ شام ترے خیمۂ ابرو سے اُٹھا

گریۂ نیم شبی دستِ دُعا تک آیا
اور تری یاد کا شعلہ مرے آنسو سے اُٹھا

میں کہ زندانیٔ شب تھا یہ گجر بجتے ہی!
کیسا خورشید بکف حجلۂ گیسو سے اُٹھا

میں جو درویش نہ صوفی نہ قلندر ہوں سلیم
رقص کرتا ہوا کیوں مجمعٔ ہاہو سے اُٹھا

نشیبِ خاک سے میرا لہو پکارتا ہے
خبر نہ تھی صفِ اعدا سے تُو پکارتا ہے

طلسم خانۂ اشیاء کی اِس گرانی میں
بجائے رونقِ بازار ہُو پکارتا ہے

عجب جنوں ہے عجب ہے دریدہ پیرہنی
کہ زخم چیختا ہے اور رفو پکارتا ہے

پسِ غبارِ رہِ رفتگاں ، اِک آئینہ
نجانے کب سے مجھے روبرو پکارتا ہے

ہم اِس قدر ہیں مگر اپنی ہی صدا کے اسیر
وہ ایک ہے جو ہمیں چار سُو پکارتا ہے

کبھی کی ترک ہوئی بزمِ دوستاں، پھر بھی
فروغِ صحبتِ شب میں سبُو پکارتا ہے

سلیم جو مرے صحرا سے بے خبر گزرا
مجھے وہ ابرِ سرِ آب جُو پکارتا ہے

نہ اِس طرح کوئی آیا ہے اور نہ آتا ہے
مگر وہ ہے کہ برابر دیئے جلاتا ہے

کبھی سفر کبھی رختِ سفر گنواتا ہے
پھر اِس کے بعد کوئی راستہ بناتا ہے

یہ لوگ عشق میں سچے نہیں ہیں ، ورنہ ہجر
نہ ابتدا نہ کہیں انتہا میں آتا ہے

یہ کون ہے جو دکھائی نہیں دیا ابتک
اور ایک عمر سے اپنی طرف بلاتا ہے

وہ کون تھا میں جسے راستے میں چھوڑ آیا
یہ کون ہے جو مرے ساتھ ساتھ آتا ہے

وہی تسلسلِ اوقات توڑ دے گا کہ جو
درِ افق پہ شب و روز کو ملاتا ہے

جو آسمان سے راتیں اتارتا ہے سلیم
وہی زمیں سے کبھی آفتاب اٹھاتا ہے

میں خیال ہوں کسی اور کا، مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سرِ آئینہ مرا عکس ہے، پسِ آئینہ کوئی اور ہے

میں کسی کے دستِ طلب میں ہوں تو کسی کے حرفِ دُعا میں ہوں
میں نصیب ہوں کسی اور کا مجھے مانگتا کوئی اور ہے

عجب اعتبار و بے اعتباری کے درمیان ہے زندگی
میں قریب ہوں کسی اور کے مجھے جانتا کوئی اور ہے

مری روشنی ترے خدّوخال سے مختلف تو نہیں مگر
تو قریب آ، تجھے دیکھ لوں، تو وہی ہے یا کوئی اور ہے

تجھے دشمنوں کی خبر نہ تھی، مجھے دوستوں کا پتہ نہیں
تری داستاں کوئی اور تھی، مرا واقعہ کوئی اور ہے

وہی منصفوں کی روایتیں، وہی فیصلوں کی عبارتیں
مرا جُرم تو کوئی اور تھا یہ مری سزا کوئی اور ہے

کبھی لوٹ آئیں تو پوچھنا نہیں، دیکھنا انہیں غور سے
جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

جو مری ریاضتِ نیم شب کو سلیم صبح نہ مل سکی
تو پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ یہاں خُدا کوئی اور ہے

کوئی یاد ہی رختِ سفر ٹھہرے کوئی راہ گزر انجانی ہو
جب تک مری عمر جوان رہے اور یہ تصویر پرانی ہو

کوئی ناؤ کہیں منجدھار میں ڈوبے چاند سے اُلجھے، اور اِدھر
موجوں کی وہی حلقہ بندی، دریا کی وہی طغیانی ہو

اِسی رات اور دن کے میلے میں ترا ہاتھ چھٹے مرے ہاتھوں سے
ترے ساتھ تری تنہائی ہو مرے ساتھ مری ویرانی ہو

یوں خانۂ دل میں اِک خوشبو آباد ہے اور لَو دیتی ہے
جوں بادِ شمال کے پہرے میں کوئی تنہا رات کی رانی ہو

کیا ڈھونڈتے ہیں کیا کھو بیٹھے کس عُجلت میں ہیں لوگ یہاں
سرِ راہ کچھ ایسے مِلتے ہیں جیسے کوئی رسم نبھانی ہو

ہم کب تک اپنے ہاتھوں سے خود اپنے لئے دیوار چُنیں
کبھی تجھ سے حکم عُدولی ہو کبھی مجھ سے نافرمانی ہو

کچھ یادیں اور کتابیں ہوں مرا عشق ہو، اور یارانے ہوں
اِسی آب و ہوا میں رہنا ہو اور ساری عمر بِتانی ہو

ہوا کہیں کی بھی ہو اور شجر کہیں کا بھی ہو
زمیں تو ایک سی ہوگی سفر کہیں کا بھی ہو

بس ایک شب کی رفاقت کا خواب ہیں دونوں
مکیں کہیں کا بھی ہو اور گھر کہیں کا بھی ہو

تمام راہیں اسی رہ گزر سے ملتی ہیں
پتہ تو ایک ہی ہے نامہ بر کہیں کا بھی ہو

پسِ حکایتِ غم ایک سی کہانیاں ہیں
صدائے گریہ سنو، نوحہ گر کہیں کا بھی ہو

سلیمؔ خاک سے نزدیک تر ملے گا تمہیں
ستارا مطلعِ افلاک پر کہیں کا بھی ہو

تعبیر میں ڈھل رہے ہیں دونوں
اک خواب میں چل رہے ہیں دونوں

اک زہر جڑیں پکڑ رہا ہے
چپ چاپ پگھل رہے ہیں دونوں

وعدوں سے بنا ہوا ہے فردا
تاریخ بدل رہے ہیں دونوں

دونوں کو خبر نہیں ہے اب تک
کس آگ میں جل رہے ہیں دونوں

خورشید اُفق سے اور میں گھر سے
اک ساتھ نکل رہے ہیں دونوں

تختیاں لکھتے پڑھتے جواں ہو گئے عُمر کی بیڑیاں کاٹ دیں
ہم نے بچپن میں اپنے قلم کیا تراشے کہ خود اُنگلیاں کاٹ دیں

ان مکینوں میں ایک آخری شکل پہچان کی رہ گئی تھی مگر
تیز چلتی ہوا نے گھروں میں لگی نام کی سرخیاں کاٹ دیں

جس کی چھاؤں میں چوپال کے رنگ جمتے تھے اب وہ شجر بک گیا
جن پہ ڈالی تھیں بچّوں پرندوں نے پینگیں وہی ٹہنیاں کاٹ دیں

سر بچاتے کہ عزّت بچاتے کہ آدابِ ہمسائیگی تھے بہُت
ہم نے بستی نہ چھوڑی مگر اپنے حصّے کی سب بیریاں کاٹ دیں

اب کے گاؤں گیا تھا تو نہریں، شجر اور رستے نہیں مل سکے
یار لوگوں نے سڑکیں بنانے کی خواہش میں پگڈنڈیاں کاٹ دیں

کتنی مشکل سے دریا کے دونوں کنارے ملائے گئے تھے سلیم
ہم ابھی راستے ہی میں تھے کہ کسی نے اُدھر رسّیاں کاٹ دیں

کوئی منڈیر کوئی طاق بھی نہیں رکھتا
دیا ہواؤں سے میثاق بھی نہیں رکھتا

عجب مسافرِ آب و ہوائے صحرا ہوں
زمین کیسی کہ آفاق بھی نہیں رکھتا

میں دشمنی میں کھڑا ہوں مگر عدو میرا
مری طرح دلِ مشتاق بھی نہیں رکھتا

یہ چاہتا ہوں مجھے لوگ بار بار پڑھیں
مگر میں ایسے تو اوراق بھی نہیں رکھتا

بدن میں پھیل رہا ہے بہت دنوں سے سلیم
وہ زہرِ عشق جو تریاق بھی نہیں رکھتا

سلیم کوثر:۔ تاریخی جنگوں اور حالی کے دیس "پانی پت" میں پیدا ہوئے اور دونوں روایتوں کے امین بنے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پہلے جھنگ اور پھر خانیوال میں رہے۔ ۱۹۷۰ء میں کراچی آئے۔ پہلا شعری مجموعہ "خالی ہاتھوں میں ارض و سما" شائع ہو چکا ہے۔

ایک غیر رسمی نقّاد

اے۔ کے۔ سومار

"عشقِ رسولؐ اقبال کی فارسی شاعری میں"

اے۔ کے۔ سومار

اقبال کی فارسی شاعری میں عشقِ رسولؐ

دوستو اور بزرگو!

آج کی اِس تقریب کا موضوع میرے پاکستان سے باہر جانے سے پہلے طے ہوا تھا۔ "اقبال اور عشقِ رسولؐ"۔ پھر ترمیم کی گئی کہ "عشقِ رسولؐ اور اقبال" اگرچہ ان دونوں میں ایک خفیف سا فرق ہے لیکن مجھے شورش کاشمیری مرحوم کی یہ بات یاد آگئی کہ

"درد کو الٹو بھی تو درد رہتا ہے"

اس محفل میں مجھے آکر یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ صرف اقبال کی نعتیہ شاعری سے متعلق جلسہ نہیں بلکہ جلسۂ سیرت نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے۔

میں اپنی طبیعت کے اعتبار سے موضوع سے روگردانی کرنا صحیح نہیں سمجھتا، اس لئے میں شش و پنج میں رہا، کیونکہ جلسۂ سیرت کی تقریر کا بھی لحاظ رکھنا ہے۔ دوسری طرف مشکل یہ آپڑی کہ آج سے پہلے میں نے اقبال پر عمومی تقریریں کی تھیں۔ میری پرورش اور تربیت جس فضا میں ہوئی اس فضا میں اقبال کے اتنے شعر تو یاد ہو ہی گئے ہیں کہ اقبال کے فکر و نظر کے مختلف پہلوؤں پر اُن اشعار کے حوالے سے ڈیڑھ دو گھنٹے کی تقریر کی جاسکے۔ لیکن آپ نے موضوع کو عشقِ رسولؐ تک محدود کر کے اسے اور بھی پھیلا دیا ہے۔ عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ وسعت کس چیز میں ہو سکتی ہے۔

اب مجھے اس مرحلۂ سخت کا سامنا ہے کہ میں عشق کی شدت کے ساتھ بھی انصاف کر سکوں، مرتبۂ

شعرِ اقبال کی طرف بھی اشارے کر سکوں اور نبیٔ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بارے میں بھی چند معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکوں کہ اُن کا عشق ہی اساسِ ایمان ہے۔ عشق صرف ربط کا نام نہیں بلکہ یہ نام ہے تعلقِ شدید کا۔ جہاں عشق کا اظہار ہو اس کو سمیٹنا مشکل ہے۔

وقت بہت ہو چکا ہے اور ابھی ایک اور تقریب میں شرکت کرنی ہے اس لئے میں اختصار کے ساتھ اقبال کے اشعار کا سہارا لیتے ہوئے اس موضوع پر کچھ عرض کروں گا۔ اقبال کے نعتیہ اشعار روداد عشق ہی تو ہیں اس وجہ سے میں اپنی طرف سے کم عرض کروں گا اور شعرِ اقبال کے آئینوں میں عشقِ رسولؐ کا عکس آپ کو دکھاتا چلوں گا۔

شعر و سخن میں نعت گوئی کا بہت بڑا مقام ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مسلمان شاعر ہو جسے اللہ نے شعر و سخن کی متاع عطا کی ہو اور اس نے سرورِ کونین کی شان میں کچھ نہ کہا ہو۔ دو ایک ایسے شاعر ضرور ہیں جن کے نام مسلمانوں جیسے ہیں اور انہوں نے نعت میں کوئی شعر نہیں کہا۔ یہ بدنصیبی اور بدبختی کے سوا اور کچھ نہیں۔

شاعری ایک نعمتِ خداوندی ہے اور یہ نعمت ہر کس و ناکس کو نہیں ملتی۔ کتنے ہی بڑے نقاد، سخن فہم اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں یا اپنے معیار کے مطابق شعر نہیں کہہ پاتے۔ علامہ نیاز فتح پوری کیسے بڑے نقاد اور سخن فہم تھے انہوں نے شعر بھی کہے اور اپنی شاعری کو اہم بھی سمجھتے تھے لیکن اُن کی شعر گوئی کا اُن کے درجۂ انتقاد سے کوئی علاقہ نہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شاعری ایک وہبی اور فطری نعمت ہے۔ اور خوش نصیب ہے وہ شاعر جو اپنی صلاحیتِ شعری کو ثنائے خواجۂ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صرف کرے۔

اقبال کو بنیادی طور پر مروجہ معانی میں نعت گو شاعر نہیں کہا جا سکتا حالانکہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا بڑا حصہ عشقِ رسولؐ سے عبارت ہے۔ اقبال اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو کسی سطحی اطمینانِ فکر کے مالک ہوں۔ وہ ایک بے قرار روح تھے جس کی تلاش و جستجو بہت تیز تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں شعر گوئی کی قوت عطا کی تھی۔ ابتداءً یہ قوت وطنی نغموں کے لئے استعمال کی

گئی، لیکن ۱۹۰۵ء میں دورۂ انگلستان کے ساتھ اُن کے فکر کا نیا دور شروع ہوا۔ روشنیٔ فکر و نظر، انسانی مستقبل، اور امن و سلامتی کے بلند و بانگ دعوے سُنے اور جب وہ ان دعوؤں اور نعروں کی گہرائی میں پہنچے تو وہاں وہ تیرگی ملی کہ وہ حیران ہو گئے اور اب انہیں تلاش ہوئی ایسے ایک نظام کی جو انسانیت کے دُکھ درد کا مداوا بن سکے۔ اقبالؔ انسانیت کے لئے ایک بہتر سماجی نظام کے متلاشی تھے اور یہ معاشرتی نظام انہیں اسلام کی صورت میں مل گیا۔ یہ اُن کی تلاش کا ماحصل تھا اور ان کی انسانیت دوستی کا نقطۂ عروج۔ پھر وہ اس سے رو گردانی کیسے کر سکتے تھے۔ اقبالؔ کا تصورِ اسلام بہت وسیع ہے۔ یہ وہی تصور ہے جو ہمیں قرآنِ حکیم کے اوراق اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی میں ایک محسوس و مشہود شکل میں نظر آتا ہے۔

اقبالؔ نے اسلام کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ نے انہیں اسلام کی اجتماعیت تک پہنچایا اور اس کا اظہار ۱۹۳۰ء کے خطبے میں بڑے حُسن سے ہوا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "میں کسی جماعت کا راہنما نہیں ہوں اور نہ کسی راہنما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ اسلام، اسلامی فقہ، سیاست، تہذیب، تمدّن اور ادبیات کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیماتِ اسلامیہ کی رُوح سے رہا ہے میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالم گیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے"۔ اقبالؔ کے اِن الفاظ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقبالؔ نے اسلام کو کس حد تک اور کس طرح سمجھا تھا۔

دوستو اور بزرگو!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی نعمتیں عطا کی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی نعمت خود اسلام ہے کہ اللہ کے نزدیک صرف یہی دین مقبول ہے۔ دوسری بڑی نعمت اس کی کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں اور تیسری نعمت جو اسی سلسلے کی کڑی ہے وہ ذاتِ رسالت مآب صلعم ہے جس کا اسوۂ حسنہ قرآن کے الفاظ میں بہترین نمونہ ہے۔

قرآن مجید اور ذاتِ رسالت مآب میں ایسا گہرا ربط ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کی عظمت تک

پہنچایا نہیں جا سکتا۔ اس ربط کو سمجھے بغیر اقبال کی شاعری کو بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اقبال جس بات کو لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے وہ سرورِ کائنات کی ذات اور تعلیماتِ قرآنی سے اخذ کرتا ہے۔ وہ قرآن و ذاتِ رسالت مآب کے ربط کو آشکار کرتا ہے۔ ہماری ملت کا شیرازہ اسی ربط کا نتیجہ ہے۔

قرآن حرفِ ربّی ہے اور ذاتِ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم مظہرِ صفاتِ خداوندی ہے۔ ملتِ اسلام کی تشکیل کا پہلا رکنِ اساسی توحید ہے اور دوسرا رکن رسالت ہے۔ اقبال نے کسی جگہ کہا ہے کہ "اللہ تعالےٰ نے ہمیں ایک دین عطا کیا اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیں ایک ملت، ایک قوم بنایا۔ اس نکتہ کو رموزِ بےخودی میں آشکار کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ ہماری اجتماعی تکوین اور ہمارا آئین رسالت کا عطیہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسبت نے ہمیں ایک قوم بنایا، ایک ایسی قوم جو اقوامِ عالم کے لئے رحمت کا پیغام ہے۔

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزارِ ما یک است
جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم
اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

رسالت کی یہ تشکیلی قوت تحریکِ پاکستان کے دور میں اُبھر کر سامنے آئی۔ جب ہم حقیقی معانی میں ایک قوم بن گئے تھے اور ہمارا مدعا ایک ٹھہرا تھا یعنی پاکستان۔ آج چار قومیتوں، پانچ زبانوں، تہتر فرقوں کی بات ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ رسالت کا گہرا اور حقیقی مفہوم مفادات کی گرد میں نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ آج آپس میں اسی لئے ٹکراؤ ہو رہا ہے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہمارے تعلق کی کئی سمتیں ہیں۔ ایک طرف تو اُن سے شخصی وابستگی ہمیں مسلمان بناتی ہے۔ نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت

تک مومن نہیں بن سکتا جب تک میں اُسے اس کی اولاد، ماں باپ، تمام انسانوں یہاں تک کہ اُس کے اپنے نفس سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔" دوسری طرف آپ مظہرِ صفاتِ ربانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات ان محاسنِ اخلاق کا اشارہ ہیں جن سے مسلمان کی زندگی اخلاق اللہ کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ یوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مومنِ اول اور اقبال کے مردِ کامل ہیں۔ آپ کی زندگی اور اسوۂ حسنہ ہی نے اقبال کے قلندر، درویش، مردِ خدا آگاہ وخدا مست کو جنم دیا ہے۔ تیسری طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری ہیئتِ اجتماعیہ کے عناصر کی اساس ہیں۔ اقبال نے رموزِ بے خودی میں مقاصدِ رسالتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشان دہی کی ہے۔

آپؐ کی رسالت کا بنیادی مقصود اقبال کے الفاظ میں "تشکیل وتاسیسِ حریت ومساوات واخوتِ بنی نوعِ آدمؐ ہے۔ غیر اللہ کی عبدیت سے نجات انسان کی حُریت کی ضمانت ہے اور پھر یہی آزادی اور ایک خالق سے سب انسانوں کا رشتہ انسانی مساوات اور اخوت کو جنم دیتا ہے۔ انسان کے پیروں میں کتنی زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ سطوتِ کسریٰ وقیصر کی زنجیر، کاہن وپاپا وبرہمن کے اقتدار کی زنجیر، سلطان وامیر کے استبداد کی زنجیر۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام زنجیروں کے حلقے توڑ دیئے۔ انسان کو اخوت ومساوات کی چار دیواری میسر آئی اور اس کو نئی زندگی ملی۔

قوتِ او ہر کہن پیکر شکست
نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید
بندہ را باز از خداونداں خرید

اب اسی سلسلۂ کلام وفکر کو آگے بڑھایئے تو یہ حقیقت ہم پر اقبال کی شاعری کے توسط سے واضح ہو جائے گی کہ توحید ورسالت کے عناصر کی وجہ ہی سے ملتِ محمدیہؐ حدودِ مکاں اور قیودِ جغرافیہ سے بالاتر ہے۔ ہم ہند وروم وشام سے وابستہ نہیں بلکہ ہماری جنم بھومی اسلام ہے۔ ہماری قومیت کے اسی پہلو کو آشکار کرنے کے لئے سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ہجرت فرمائی تاکہ جغرافیہ سے بالاتر ایک قوم کی ریاست اور ہیئتِ اجتماعی کو ایک نئی سرزمین میں منتقل کیا جائے۔ یہی وہ سُنت ہے جسے ہم نے بیسویں صدی میں قیامِ پاکستان اور ہجرت کے ذریعہ دوہرایا ہے۔ ہجرت ہی ہماری زندگی کا آئین ہے اور اسی سے ہماری حیاتِ ملّی کو ثبات حاصل ہے۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملّتِ گیتی نورد
بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

ہجرت آئینِ حیاتِ مُسلم است
این ز اسبابِ ثباتِ مُسلم است

اسی حقیقت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس طرح ملّتِ اسلامیہ قیدِ مکانی سے بالاتر ہے اسی طرح نہایتِ زمانی بھی نہیں رکھتی۔ فخرِ آدم، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج تسخیرِ زمان ومکاں کی زندۂ جاوید اور ابدی دستاویز ہے۔

اقبالؔ کو ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید ذاتی وابستگی ہے ان کے نزدیک تو جتنی زمین میں نبیٔ آخرالزماں کا جسمِ اقدس آرام فرما رہا ہے وہ کعبہ سے زیادہ محترم ہے۔ یہی بات شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی فرمائی تھی اقبالؔ کہتے ہیں کہ ؎

وہ زمیں تو ہے مگر اے خواب گاہِ مصطفےٰؐ
دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر کے سوا !

اقبالؔ کی اردو شاعری کی روشنی میں عشقِ مصطفےٰؐ کی جھلکیاں پروفیسر صاحب اپنی تقریر میں پیش کر چکے ہیں لیکن اس شعر سے گزرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

اب تک جو کچھ میں نے عرض کیا اس میں کوشش یہی کی کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اقبال کے عشق کے دائروں کو بھی پیش کیا جاسکے۔ یہ دائرے ذاتی زندگی سے اجتماعی نظام تک

محیط ہیں۔ اس کا سبب حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی جامعیت اور پھیلاؤ ہے۔ آپؐ کی زندگی میں افراد اور اقوام کی حیات کے ہر دور اور ہر مرحلہ کے لئے حل اور نسخہ شفا اور نمونہ موجود ہے۔ حرا کی تنہائیوں اور تفکر سے لے کر مدینہ کی اسلامی ریاست کے قیام تک۔ آپؐ نے ایک طرف تزکیۂ ذات و روح کے نکات تعلیم فرمائے تو دوسری طرف انسان کو فرد اور معاشرہ کے رشتہ سے باخبر کیا اور ایک ایسے منظم انسانی معاشرہ کی تشکیل کا گر سکھایا جو عدل، مساوات اور اخوت کی بنیاد پر استوار ہوا ہو۔ اقبالؔ نے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ اپنے اشعار میں کیا ہے ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید | قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محرومِ نوم | تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
وقتِ ہیجا تیغ او آہن گداز | دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دعائے نصرت، آمیں تیغ او | قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغ او
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد | ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد

مناسب ہوگا کہ ان اشعار کا مفہوم آپکی خدمت میں پیش کر دیا جائے کیونکہ فارسی کا ذوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرا کی خلوتوں سے باہر نکل کر قوم، آئین اور حکومت تخلیق فرمائی۔ راتوں کو آپؐ کی آنکھیں محرومِ خواب رہیں اور آپؐ کی انہیں شب بیداریوں نے امتِ مسلمہ کو تختِ اقتدار پر اطمینان کی نیند عطا کی۔ ایک طرف تو ہنگامِ جنگ آپؐ کی تلوار سے قلبِ فولاد پگھل جاتا تھا اور دوسری طرف آپؐ کی آنکھوں سے وقتِ سجود و نماز آنسو جاری رہے۔ آپؐ جب اللہ کے حضور دعائے فتح فرماتے تو آپؐ کی تلوار اس دعا پر آمین کہتی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھول دیا۔

حضرات!

یہی وہ سبق ہے جو ہمیں سیرتِ نبیٔ آخر و کامل صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھنا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین نے دین و دنیا کی ثنویت ختم کر دی۔ ہمارے ہاں صرف خلوت گزینی

دین نہیں بلکہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ بھی دین ہے۔ عبادات راتوں کے سجدوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ایوانِ آئین و حکومت میں بیٹھ کر اسلامی دستور کو نافذ کرنے کی سعی و کوشش بھی دین ہے۔ جماعت نماز میں محمود و ایاز کی یک جائی ہی دین نہیں بلکہ زندگی کے کاروبار میں انسانوں کی اخوت دین کی بنیاد ہے۔ اور دین کے یہ نکات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی اتباع اور اُن کے دامن کو ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے رہنے ہی سے ہماری زندگی میں عملی طور پر جھلک سکتے ہیں۔ یہی مقصودِ دین ہے اور یہی اقبال کا پیغام ہے۔

میں نے بنیادی طور پر اقبال کی فارسی شاعری کو سامنے رکھتے ہوئے چند باتیں عرض کی ہیں، لیکن آخر میں اقبال کے وہ دو، دو اشعار ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں جن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے کو پیش کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی گئی ہے، اور جن کا ہر لفظ مجھے دل کی طرح دھڑکتا ہوا سنائی دیتا ہے ؎

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

---

۳ اپریل ۱۹۳۶ء کو اقبال نے دارالاقبال بھوپال میں سرسید احمد خاں کو خواب میں دیکھا جنہوں نے اقبال سے کہا کہ "اپنی علالت کا احوال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرو" اس پر جو نظم قلم بند ہوئی اس کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے تو ما بیچارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ

سوختی لات و منات کہنہ را
تازہ کردی کائناتِ کہنہ را

در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰتِ صبح، تو بانگِ اذاں

لذتِ سوز و سرور از لَا اِلٰہ
در شبِ اندیشہ نور از لَا اِلٰہ

نے خداہا ساختیم از گاؤ خر
نے حضورِ کاہناں افگندہ سر

نے سجودے پیشِ معبودانِ پیر
نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور
قوم را دارد بہ فقر اندر غیور

اے مقام و منزلِ ہر راہرو
جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو

سازِ ما بے صوت گردید آنچناں
زخمہ بر رگہائے او آید گراں

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ

در جوانی نرم و نازک چوں حریر
آرزو در سینۂ او زود میر

ایں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
حریتِ اندیشۂ او را حرام

مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود
از وجودش ایں قدر دانم کہ بود

ایں ز خود بیگانہ، ایں مستِ فرنگ
نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ

ناں خرید ایں فاقہ کش با جانِ پاک
داد ما را نالہ ہائے سوزناک

ایک غیر ملکی ادیب

چھوچھی تنگ

"قومی زبان، قومی جذبہ، قومی عظمت"

چھو چھی تنگ

قومی زبان، قومی جذبہ، قومی عظمت

اس سوال پر کہ ہم اُردو سیکھنے پاکستان کیوں آئے ہیں، بعض لوگوں نے جس تعجب کا اظہار کیا، اس پر خود ہمیں بھی بڑا تعجب ہوا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ایک ایسی زبان ہے، جو اس لائق نہیں ہے کہ اسے سیکھا جائے۔ یہ سوال چھوٹا اور معمولی سا ہے مگر اس میں ایک بڑی بات مضمر ہے۔

اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے، پاکستان کے تمام صوبوں کے لیے یہ رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لحاظ سے پاکستان کی سماجی زندگی میں اس کی اہمیت سب پر عیاں ہے۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو زبان کے بغیر پاکستان کی سماجی زندگی چل سکتی ہے۔ کوئی ایک ہزار سال کی ترقی اور نشوونما کے بعد اردو اب ایک بہت مستند اور معیاری زبان بن گئی ہے اور اس کا شمار دنیا کی اہم زبانوں میں ہوتا ہے۔ برصغیر کے تقریباً بیس کروڑ سے زائد عوام یہ زبان استعمال کرتے ہیں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں بیسیوں ریڈیو اسٹیشنوں سے اُردو میں نشریات ہوتی ہیں جو ساری دنیا کے اُردو بولنے والوں کیلئے مفید خدمت انجام دے رہی ہیں۔ کیا یہ حقیقت ایسی نہیں ہے جس پر پاکستانی عوام کو فخر و مباہات کرنے کا پورا جواز ہو؟

مترجم کی حیثیت سے میں اُردو پڑھنے پاکستان آیا ہوں۔ ہم اُردو سے محبت کرتے ہیں اور اس سے ہمارے جو جذبات و احساسات وابستہ ہیں، وہ کسی صورت میں بھی ایک پاکستانی سے کم نہیں! اس کی وجہ نہ صرف یہ ہے کہ ہم اُردو

سے کام لیتے ہیں، بلکہ یہ کہ یہ ہمارے ایک نہایت دوست اور ہمسایہ ملک کی زبان ہے۔

لیکن ادھر جو پانچ مہینے ہم پر گزرے ہیں۔ یہ مجھے بے اختیار پوچھنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ کیا ہر ایک پاکستانی کے دل میں اردو زبان کی قدر و قیمت اور اس سے محبت موجود ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔!

ہم دوکانوں پر چیزیں خریدنے جاتے ہیں، بس پر سوار ہوتے ہیں، سڑکوں پر گھوم پھرتے ہیں اسینما گھر میں پکچر دیکھنے جاتے ہیں، لوگوں کے لبوں پر سب سے پہلے یہی جملے پاتے ہیں۔" "سر! واٹ ڈو یو وانٹ؟" "واٹ کن آئی ڈو فور یو؟" ایسے انگریزی جملے لوگوں کی زبان پر رٹتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ' ہاں صاحب' آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں آپکی کیا خدمت کر سکتا ہوں' جیسے خالص اردو کے جملے میرے سننے میں بہت کم آتے ہیں۔ جب ہم یہ انگریزی جملے سنتے ہیں تو ہمیں بہت تشویش ہوتی ہے اور دکھ بھی۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ لوگ اپنی قومی زبان کے بجائے انگریزی بولتے ہیں۔ کیا انگریزی بولنے میں کوئی شان ہے؟ کوئی ناز ہے یا کوئی بلندی ہے؟ ایسے میں مجھے ایک بات یاد آگئی۔ میرے ایک دوست ہیں، وہ بحری جہاز کے کپتان ہیں، انگریزی تو ضرور بول لیتے ہیں۔ ایک بار وہ مغربی جرمنی گئے تھے۔ ایک دن دوکان پر گئے۔ انہوں نے انگریزی میں دوکاندار کو سلام کیا اور کوئی چیز خریدنے کو مانگی لیکن دوکاندار نے بہت اچھی اور معیاری انگریزی میں جواب دیا "جناب' ہم جرمن ہیں اور انگریزی ہماری زبان نہیں ہے' آپ جرمن میں بات کیجئے۔"

یہ سُن کر میرے دوست پہلے حیران اور پھر بہت متاثر ہوئے۔ دوکاندار کے قومی جذبے کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن میں بات کرنا شروع کی، اور اس طرح دوکاندار نے اپنے قومی تشخص کی بحالی کا ثبوت دیا۔ پھر دونوں میں سودا طے ہو گیا۔ بعض لوگ شائد اب ایسا محسوس کرتے ہونگے کہ اس دکاندار نے کچھ زیادتی کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ زیادتی معلوم ہوتی ہو، کیونکہ اگر گاہک جرمن

بالکل نہیں جانتا تو سودا کیسے طے ہو سکتا؟ آخر دکاندار کو انگریزی میں بات کرنا پڑتی۔ مگر یہ مثال دینے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ بڑی مجبوری کے عالم میں بھی کوئی اپنی قومی زبان بولنے کا سختی سے پابند ہو۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے قومی جذبہ کو فروغ دینا چاہیئے۔

پرانے چین میں خاص طور پر شنگھائی میں جس پر انگریزوں اور امریکیوں کا تسلط تھا، انگریزی بولنے کا دور دورہ تھا۔ وہاں کی حالت کسی حد تک ویسی ہی تھی جیسی اب کراچی کی ہے۔ اس زمانہ میں اعلیٰ طبقے کے لوگ انگریزی بولنے پر فخر کرتے تھے اور انگریزی زبان ان کی شان اور بڑائی کی ایک علامت بن گئی تھی۔ حالانکہ یہ لوگ تعداد میں کم تھے، لیکن ان کے اثرات عوام پر اتنے گہرے تھے کہ عام لوگ بھی اپنی زبان پر "آخر" کے بجائے "لاسٹ" "آدھا" کے بجائے "ہاف" اور "چہرہ" کے بجائے "فیس" جیسے انگریزی الفاظ لایا کرتے تھے۔ کیا کئی ہزار سال تاریخ کی حامل چینی زبان میں آخر، آدھا اور چہرہ جیسے عام الفاظ موجود نہیں تھے؟ یہ سب کچھ مٹھی بھر انگریزی بولنے والے چینیوں کے بُرے اثرات کا نتیجہ تھا۔ ان برے اثرات کو ختم کرنے کے لئے آزادی کے بعد ہماری حکومت کی طرف سے بڑی کوشش کی گئی۔ اس میں ہمارے محترم سابق وزیراعظم چو این لائی مرحوم نے ہمارے لئے بہت شاندار مثال قائم کی۔ وہ خود انگریزی بہت اچھی جانتے تھے لیکن ان کے ساتھ ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی سرکاری سفارتی سرگرمی میں انگریزی بولتے۔ انہوں نے فرمایا کہ "چینی زبان چینی عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ میں چینی ہوں، اس لئے میں چینی زبان بولتا ہوں۔" اب چین میں ابتدائی مدرسہ سے جامعہ تک کے تمام مرحلوں کی تعلیم چینی زبان میں دی جاتی ہے اور چینی زبان کی بھی بہت اصلاح کی گئی ہے۔

قومی زبان ایک قوم کی طویل تاریخ کے ساتھ ساتھ ترقی پاتی ہوئی ارتقائی صورتوں میں ڈھلتی جاتی ہے۔ ایک قوم کے مزاج کی ترجمانی اس کی قومی زبان سے بہتر کسی اور چیز سے نہیں ہوسکتی۔ ایک قوم کے جذبات اور احساسات کا اظہار اپنی قومی زبان کے علاوہ کسی اور غیر ملکی زبان سے نہیں ہوسکتا۔ جس طرح اپنی قوم کی تمام چیزوں سے محبت ہوتی ہے، بالکل اسی طرح اپنی قومی زبان کے بارے میں بھی لوگ اس قسم کا جذبۂ الفت رکھتے ہیں۔ یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اگر ہم چینی کسی ایک پاکستانی سے انگریزی میں بات کریں تو وہ اتنے متاثر ضرور نہیں ہوں گے جتنے ہمارے اُردو بولنے سے ہوتے ہیں۔ خود ہمیں بھی اس کا تجربہ ہوا ہے۔ جب لوگ ہمیں اُردو بولتے سنتے ہیں تو انہیں تعجب کے ساتھ اتنی خوشی ہوتی ہے کہ جس کی توقع ہمیں پہلے سے نہیں ہوئی ہوتی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اردو بولنے سے دلوں کے درمیان یگانگت وقربت پیدا ہوگئی ہیں اور اجنبیت، جو قدرتی طور پر موجود تھی، دور ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے دل میں قومی جذبہ پنہاں ہے۔ یہ ایک ایسا فطری جذبہ ہے کہ بعض اوقات لوگ خود بھی اسے اچھی طرح محسوس نہیں کرتے۔ لیکن جب کبھی موقع آتا ہے، یہ جذبہ لوگوں کے دل کی گہرائیوں سے خود بخود نکل آتا ہے۔ مذکورۂ بالا مثال اس کا بہترین ثبوت ہے۔

ہر پاکستانی کے لئے انگریزی بولنا فخر کا باعث نہیں بننا چاہیئے، بلکہ اُردو نہ بولنے سے شرم آنی چاہیئے۔ پاکستان بننے کے بعد اب تیس سال سے زیادہ ہوچکے ہیں۔ پاکستان پر انگریزوں نے جو اپنے اثرات چھوڑے تھے وہ زیادہ تر مٹ چکے ہیں۔ اسی حالت میں اگر کوئی پھر بھی انگریزی بولنے پر فخر کرے تو اُس سے ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کا قومی جذبہ کہاں غائب ہوگیا ہے؟ اُردو

سے آپ کو رتی بھر بھی محبت ہے یا نہیں - قومی جذبہ لوگوں کو قومی زبان بولنے پر آمادہ کر دیتا ہے اور قومی زبان ایک قوم کی خود مختاری کی بہت اہم علامت ہے - قومی زبان بولنے میں ایک قوم کی عظمت ہے فرض کیجئے کہ اقوام متحدہ میں پاکستان کا نمائندہ ساری دنیا کے سامنے اپنی قومی زبان اُردو میں تقریر کرے اور اس کی آواز دنیا کے گوشے گوشے میں گونج اٹھے، تو ایک پاکستانی کے دل میں کتنا ولولہ پیدا ہو سکتا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان ایک بالکل خود مختار ملک کی حیثیت سے بین الاقوامی معاملات میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اور پاکستان کی قومی آواز ساری دنیا میں سنی جاتی ہے - یہی پاکستان کی عظمت ہے۔

ہم چینی خوشی سے دیکھتے ہیں کہ قومی زبان کو فروغ دینے کے لئے پاکستان کی حکومت نے کافی کوشش کی ہے اور اب اور بھی زیادہ کوشش کر رہی ہے - اس سلسلہ میں قابلِ ستائش نتیجے حاصل ہوئے ہیں اب زیادہ سے زیادہ لوگ اردو بولنے پر فخر کرتے ہیں، پاکستان کی سماجی زندگی میں اُردو کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور ساری دنیا میں اس کے اثر اور نفوذ میں اضافہ ہو رہا ہے - موجودہ دورۂ چین کے دوران ضیافت کے موقع پر صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے اُردو میں تقریریں کیں - یہ پاکستان کے پہلے صدر ہیں، جنھوں نے دوسرے ملکوں کے دورے میں اُردو میں تقریریں کی ہیں - پوری پاکستانی قوم کے لئے یہ ایک بہت اچھی مثال قائم کی گئی ہے - اور اس کی پیروی ہر ایک پاکستانی کو کرنی چاہیئے -

آیئے، ہم پاکستانی عوام کے ساتھ اُردو کی ترقی و فروغ کے لئے مشترکہ کوشش کریں -

---

چھو چھی تنگ :- عوامی جمہوریہ چین کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر (بیجنگ) کے شعبۂ اردو میں مترجم کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

افسانہ

خوشبو کا ایک لمحہ

محمود واجد

محمود واجد

"خوشبو کا ایک لمحہ"

شاید ایسا ہی ہونا تھا — آنکھیں کھلیں تو عصر کا وقت تھا — "بے شک انسان سخت خسارے میں ہے!" — کچھ ایسے ضروری سوالات تھے جن کے لئے جگا کر جواب طلب کرتے ہیں ۔ میں تیاری کرنے لگا ۔ سن تو میں نے بہت کچھ رکھا تھا مگر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میرے لئے کوئی اور سوال ہوں — میں نے اپنے پاؤں سکوڑنے چاہے کہ آنے والے لمحوں کا انتظار کروں ۔ پھر مجھے یاد آیا کہ روح تو میرے اوپر کے جسم میں ڈالی گئی ہے — کیا یہ ممکن ہے کہ نصف حصہ برسوں تک زندہ رہے یہاں تک کہ خود ایک سوالیہ بن جائے اور دوسرا — برسوں تک کیا صدیوں تک ممکن ہے بلکہ اُس وقت تک جس کا علم وقت کی قسم کھانے والے کو ہی ہو سکتا ہے — مجھے سرگوشیاں کرنے والا دکھائی نہ دیا — جواب دینے کی مجھے کوئی ایسی جلدی نہ تھی نہ یہ الجھن کہ جواب بن پڑے گا بھی یا نہیں میرے سامنے سے خوشبو کا ایک لمحہ سا گزر گیا — "شیکسپیئر کی تصویر دیکھی ہے — اب اسے دیکھو!" — عصر کی نماز کے بعد مسجد کے دروازے سے لگے ایک بزرگ کے مزار سے متصل چبوترے پر تسبیح پڑھتے ہوئے ابّو نے اپنے ساتھی سے کہا — میں فٹ بال ہاتھ میں گھماتا قبرستان، نالے اور جھاڑیاں پھلانگتا ہوا جلدی سے اُس باغ میں پہنچ گیا جس کے درمیان میں ایک میدان تھا اور جس کے وسیع ہونے کی اُمید پر ہم خوش تھے کہ زمین داری کے خاتمہ کی افواہ سن کر تیزی سے درخت کاٹے جا رہے تھے ۔ اُن میں آم اور جامن کے وہ درخت

بھی تھے جن پر ہم اسکول جاتے ہوئے دو چار ہاتھ ضرور صاف کرتے تھے —— ہم نیل گائے کے پیچھے گنّے کے کھیتوں میں بھاگ رہے تھے - اِدھر کی کھونٹیوں کے چبھنے کے احساس سے بے نیاز میلوں بھاگتے رہے کہ جنگل میں پلے ہوئے اس جانور کے گرم اور تازہ گوشت کا تصور بہت لطیف تھا - اور جب وہ گر گئی تو ہم اُسے اٹھا نہیں سکے کہ یہ ہندوؤں کا گاؤں تھا —— ہاتھ اٹھا کر میں نے اپنے سر کو دیکھا —— بیچوں بیچ ایک گہرا نشان تھا —— دو دِنوں تک میں بے ہوش رہا اور اس ڈالی کو جھلانے والا لڑکا مجھ سے آنکھیں ملانے کی ہمت خود میں نہیں پا رہا تھا - جب میرے گھر سے اس کا جنازہ اٹھا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

—— تیز بارش ہو رہی تھی - کئی دنوں سے ہم جاگ رہے تھے اور اذانیں دے رہے تھے کہ بلائیں دفع ہوتی ہیں - سارا گاؤں خالی ہو رہا تھا - ڈاکٹر نے کہا تھا بس آج کی رات ہے - کئی دنوں سے ہم ایسی باتیں سن رہے تھے - شام پڑے ہی سو گئے اور جاگے تو پیشانی پر گرم لبوں سے محسوس ہوئے (پہلے اور آخری کہ ہم باپ کو ماں کے حوالے سے جانتے ہیں) دیکھا —— امّی کے جسم پر چادر ڈال دی گئی ہے اور آیتیں پڑھی جا رہی ہیں - پڑھنے والے کی آنکھوں میں سمندر نہیں ہے —— صبح بوڑھے برگد کی باہوں کے کٹنے کی آواز آئی تو یقین ہو گیا کہ وہ کچھ نہیں رہا جو تھا —— جب وہ چلنے لگے تو کہا —— "ان کا خیال رکھنا" —— بھیّا، بھابی اور بچے یہ میری کل کائنات تھی —— میں نے کروٹ بدلی —— میرے پاؤں پر کسی کے ہاتھ تھے —— "پڑھتے پڑھتے سو گئے تھے نا، شاید تھک گئے ہوں" —— شرمندہ نہ کریں (میں کہہ نہیں پاتا) —— بالوں میں انگلیاں کنگھی کر رہی ہیں "سر کا درد کیسا ہے؟" —— میں کاغذ پر جھکا ہوا ہوں —— "کیا لکھا جا رہا ہے —— کسی لڑکی کو...... آئینہ دیکھتے ہوئے میں ہنس پڑا ——

میں نہیں دیا — گلاس کی طرف اشارہ کر کے کہا "باہر روشنی جل رہی ہے، صراحی وہیں رکھی ہے" — خواب کی سی کیفیت میں چلتی ہوئی جب وہ واپس آئی تو گلاس خالی تھا — بیٹھے بیٹھے سو گئی شاید!

"جی ابّو! آنکھیں بند کئے ہوئے اس نے کہا۔ جی چاہا بہت زور سے ایک تھپڑ ماروں مگر — بھرا ہوا گلاس دے کر اس نے کہا: — "ابھی امّی کو دے کر سوئی ہوں!" — وہ تو آپ نے جنت کے پودے میں پانی ڈالا ہے بیٹے! — کوئی سوال نہیں کرتی۔ وہیں سو جاتی ہے۔ میرے پاس ہی جہاں اس کے چھوٹے بہن بھائی سو رہے ہیں۔ میں اپنے پاؤں سکوڑ لیتا ہوں کہ یہ میری قبر نہیں!۔

خوشبو جو عورت کے جسم میں ہوتی ہے — خوشبو جو زندگی میں ہوتی ہے۔ خوشبو جو گلاب میں ہوتی ہے اپنے اندر کانٹے بھی رکھتی ہے — خوشبوؤں کو قبول کرنا آلائشوں کو قبول کرنا بھی ہے ویسے ہی جیسے خوشی کو گلے لگاتے وقت یہ دھیان کہ یہ آنسوؤں کی پالکی میں بیٹھ کر آئی ہے۔

مجھے وہ لوگ عجیب لگتے ہیں جو بچوں کی سالگرہ مناتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں، پھول نچھاور کرتے ہیں — ایسا کرتے ہوئے شاید وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موت کا غار اب ایک قدم اور نزدیک آگیا ہے۔!

سوتے میں بچے کی مسکراہٹ کو جنازے کے جلوس سے ہم آہنگ دیکھنا ہو سکتا ہے لوگوں کو پسند نہ ہو لیکن مجھے تو یہ بہت بڑی سچائی لگتی ہے — میں تو اب جنازے کو دیکھ کر راستہ بدل لیتا ہوں۔ یہ بھائی کا ہے — یہ بہن کا ہے — یہ ماں کا ہے — یہ باپ کا ہے — یہ بیٹی کا ہے — اور کیا دیکھوں اب — ! مرنے کے بعد

"ایسے نہیں یوں اچھے لگو گے" —— اور میں سچ مچ کسی کو اچھا لگ گیا۔ جب میں نے فیصلہ کر لیا تو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میرا سفر ضروری ہے۔ یوں بھی جب میں اپنی مدد آپ نہیں کر سکتا تو دوسروں کی کیا کروں گا —— اور تب میں نے اپنی مدد زیادہ کی اور ان کی کم —— مگر وہ یقین نہ کر سکے کہ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے —— "زندگی بھر پودے کو سینچتے اور جب تناور درخت ہو جائے تو ایک گھنیرے سائے میں گم —— !"

اس بار میں گیا تو مٹی کا وہ کوٹھا جس پر جن چلا کرتے تھے اور کھانا پکانے کی خوشبوئیں آیا کرتی تھیں ڈھے گیا تھا۔ اس کی نچلی منزل میں گرمی کی بے پناہ لو سے بچ کر ایسا سکون ملتا تھا جیسی امی کے ہاتھ سے سجی الماری کو کھول کر اور باہر آ کر ایسا دکھ جو باجی کی موت کے بعد ان کی شادی کا جوڑا دیکھ کر ہوا تھا —— !

میں پھر وہاں گیا جہاں سے چلا تھا۔ اور جب میں نے رختِ سفر باندھا تو میری بیٹی نے پوچھا۔ "بڑی امی اور آپا چپ کیوں ہیں!" "تمہاری بیٹی" بچی نے کہا "ایسے نہیں بیاہو گے" —— ! پھر جو بندھا تھا وہ ٹوٹ گیا —— چند مہینوں میں پوری دالان کی کھپریل کی جو مرمت کی تھی وہ ٹپکتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں شرابور ہو گیا —— میری ماں، میری بہن، میری بیٹی —— میں جلد آؤں گا !

"ہائے تم نے میرا ذرا نہ خیال کیا بابو !" —— اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کچھ ہو گیا جو میں دیکھ رہا ہوں تو ایک سوگوار سی لہر میرے ہونٹوں کو ترسا گئی —— ایک گلاس پانی —— کیبن میں لیٹے لیٹے میں نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔ کئی آوازوں کے بعد جب وہ اٹھ بیٹھی تو میں نے پاس بلا کر پیار کیا جس کا مطلب وہ سمجھ گئی اور رونے لگی۔ "ابو مجھے سونے دیں !" —— میں نے بیٹھے ہاتھوں

نہ یہ گھر اپنا نہ وہ ——— لیکن سزا تو وہاں بھی ملے گی ——— سزا جو مقرر ہے ——— ! اجداد کی سزا آنے والی نسلوں کو ملتی ہے ——— !

——— مگر نہیں ہم ازلی گناہ گار ہونے کے تصور میں مبتلا نہیں ——— ہاں سزا تو ملتی ہے کہ ہم نے ظلم کئے ہیں اپنے آپ پر اور .... لیکن میعاد قید اگر نامعلوم ہو تو دو چار، چھ سال دو، چار، چھ صدیاں بھی ہو سکتی ہیں ——— !

بیٹا امی نے منہ دھو لئے اور کپڑے بھی بدل لئے ....

"ہاں ابو ——— میں نے ناشتہ بنانے جارہی ہوں - بھائی جان سے کہہ دیں میری مدد کریں" ——— مجھے آٹھ سال کی بچی چالیس سال کی عورت لگی ———

"منی کی بس آچلی ——— اسکا ٹفن بکس تیار کردیں ابو! باورچی خانے سے آواز آئی ——— آپ نے اپنی ٹاسک بنا لیا بیٹی ؟ اور منے نے ؟ ———

"ہاں ہماری بس تو بارہ بجے آئے گی" - منی کی آواز آئی : ——— ابو مس نے کہا ہے چوٹی باندھ کر آؤ گی !" ——— مس سے کہہ دینا امی نہیں ——— !

میں جلدی سے نکل پڑا ——— میں یونیورسٹی جارہا ہوں امی کا خیال رکھنا !

"ہم لوگ تو اسکول چلے جائیں گے !" ——— منی اس وقت تک آجائے گی اور پھر میں آؤں گا ہی ! ——— "خدا حافظ ابو !" ——— خدا حافظ بیٹے ——— میرے دوست خدا حافظ ——— !

نجی کے خط کا یہ آخری جملہ تھا ——— مٹی مٹی تحریروں میں کھویا ہوا چہرہ دیکھ رہا ہوں ——— "آپ کو دیکھے ہوئے بہت دن ہوئے ——— کیا آپ ایک روز کے لئے نہیں آسکتے ؟ اگر آسکتے ہیں تو آجایئے کسی بدنصیب پر نوازش ہو گی ۔"

دوسرا خط جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے مگر نشان زدہ فقرے پڑھے جاسکے۔

ہیں: "آپ کے آنے سے کوئی خوش ہو نہ ہو میں ضرور خوش ہوں گی۔ خوشی تو خوش نصیبوں کو ہوتی ہے مجھ بد نصیب کو کہاں —— آپ کے آجانے سے میری عید ہو جائے گی!"

"تیسرا خط ایک تیسری زبان میں لکھا ہوا ہے! "اکیلے پاؤں بھٹکنے میں ٹھیک لگتے ہوں گے لیکن کئی ایک پاؤں ساتھ چل رہے ہوں تو بھٹکنا گمبھیر بن جاتا ہے!"۔

اب سوال کا وقت آگیا ہے کہ سوال ایک لمحے کی حقیقت بھی ہے اور پوری کائینات بھی! سوال کہ یہ کچھ کیا ہے، کیوں ہے، کب سے ہے اور کب تک رہے گا؟ —— جواب کہ کچھ نہیں ہے اگر ہے تو ہونے اور نہ ہونے کی کشاکش —— ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی —— ہے مگر وہ صرف وہ جس نے زمین کے سبزے کو بچھایا اور آسمان کے خیمے کو لگایا —— تم کس کس چیز کو جھٹلاؤ گے!

معاً سوال کرنے والے اپنے پروں سمیت غائب ہو گئے کہ ان کے سوال سے پہلے میں نے جواب دے دیا تھا اور عذاب کیا ہوتا کہ اوپر کے جسم کا عذاب مجھ پر صدیوں سے نازل تھا!!

محمود واجد ہاشمی: محمود واجد ہاشمی عرصے سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ پہلے مشرقی پاکستان میں تھے۔ اب جامعۂ کراچی کے کلیۂ تجارت میں استاد ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

ایک کتاب دو نقّاد

صد برگ

محمد علی صدیقی

بلقیس شاہین

محمد علی صدیقی

صَد برگ

پروین شاکر نے بہت مختصر عرصہ میں بہت شہرت کمائی۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کسی شاعر یا شاعرہ کی شہرت میں "غیر شاعرانہ" عناصر کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں میرا یقین ہے کہ شاعر الفاظ کی تسخیر کے بڑے قلعے کی فتح کیلئے جو پاپڑ بیلتا ہے وہ سفر کی منزل سے کم اہم نہیں ہوتے۔ اصل معاملہ، بہرصورت یہی ہے اور ہونا چاہیئے کہ شاعر نے اپنے کلام کے ذریعہ وہ کون سا منفرد قلعہ سر کیا ہے جس کے لئے اپنے کلام کے ذریعہ اُس کے ہم عصروں —— بلکہ ہم سِنوں نے بہت کوشش کیں لیکن وہ اپنی ذات، اور اپنی انا کے حوالہ سے منزلیں سر کرتے رہے اور اپنے اپنے مقامِ مقصود تک پہنچے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب شعراء ایک ہی منزل کے مسافر ہوں، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ درست، غالباً خاصی درست ہے کہ ہر شاعر یا شاعرہ اپنی انفرادیت اور اپنی منزل سے خود آگاہ ہوتا یا ہوتی ہے۔

جب پروین شاکر کا پہلا مجموعۂ کلام "خوشبو" شائع ہوا تو اس مجموعہ میں واقعتاً ایک خوابناک فضا کا دور دورہ تھا۔ تحیّر اور اضطراب سے مرکب ایک ایسی فضا جو پروین شاکر سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس مجموعہ کے بارے میں بھی میری رائے یہی تھی کہ یہ مجموعۂ کلام پروین شاکر کی شناخت میں جہاں آسانیاں پیدا کر دیتا ہے وہاں کچھ رکاوٹیں بھی۔ ہم ڈسپلن کی خلاف ورزیوں کے اس قدر عادی مگر خوگر ہو چلے ہیں کہ پروین کے لہجہ کا اعتماد —— اس کی تخلیقی

قوت اور شعری زبان کے ساتھ گہری معاملت بہت سے دنیا اور ادب بیزار حضرات پر شاق گزری - کچھ حضرات نے پروین کی قدرتِ کلام کو تعریف و توصیف کا سبب قرار دیا ، کچھ حضرات نے اُس کے لہجہ کی خطابت کے حق میں ووٹ دیا لیکن مجھے بعض دیگر قارئین ادب کی طرح پروین شاکر کی شاعری میں یک گونہ جسارت اور حلاوت کے خمیر میں گُندھی ہوئی ایک ایسی تیز لیکن مانوس شعری حسیت نظر آئی جو اپنی تمام تر مانوسیت اور عام سوادی کے باوجود توجہ طلب تھی —— اس حد تک کہ میرے خیال میں "خوشبو" اُن چند شعری مجموعوں میں سے ایک ہے جنہوں نے روایت اور جدیدیت کو ایک دوسرے کا حریف اور مقابل ٹھہرائے بغیر یہ ثابت کیا ہے کہ شاعر یا شاعرہ "لوگ کیا چاہتے ہیں ؟" پر توجہ مرکوز کی بجائے اپنے "میں" کے اظہار پر اصرار کرتا ہے - یہ وصف کورانہ انفرادیت کے سامنے سپر اندازی کے مترادف نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر دال ہے کہ شاعر محض شاعری سے علاقہ رکھتا ہے اور اپنی ذات کو اس حد تک سکڑنے نہیں دیتا کہ غم دنیا اور غم جاناں کے مابین خطِ فاصل کھینچ کر یہ کہے کہ یہ "شاعری" ہے اور وہ "غیر شاعری"۔ حُسن صرف حسین اشیا، حسین محسوسات، حسین مناظر اور حسین فکر کے بطن سے نہیں پھوٹتا بلکہ وہ حد درجہ بدصورت شے اور مظہر میں بھی "شعریت" تلاش کرنے کا نام ہے تاکہ بظاہر بدصورت مظاہر میں بھی حُسن تلاش کیا جا سکے اور اس طرح حسن اور بدصورتی علیحدہ علیحدہ خانوں میں رہتے ہوئے بھی "یہ یا وہ" کا معاملہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ دیکھنے والے کے موضوعی اور معروضی سچ کے مابین ایک نقطہ اتصال وجود میں آ جائے کہ سب کچھ وہی ہوتے ہوئے بھی جو فنکار اور اُس کے لمحۂ تخلیق سے ذرا پیشتر تھا بہت کچھ بدل کر رہ جائے۔ فن کے ذریعہ موجود اور معلوم حقائق کی بے ترتیبی کی "نئی تشکیل نو" ہی نے فن

کا جواز مہیا کیا ہے۔ "خوشبو" اسی دور کا مجموعۂ کلام ہے لیکن گزشتہ پانچ سال میں ہمارے سوچنے اور تحریر کرنے کے انداز میں اس قدر تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کہ اگر پروین شاکر سے بھی یہ سوال کیا جائے کہ وہ تبدیلیاں کیا ہیں تو وہ لامحالہ طور پر جواب میں اپنا مجموعۂ کلام "صد برگ" پیش کر دیں گی۔ شاید ہی پروین شاکر کی نسل کے کسی شاعر یا شاعرہ میں گذشتہ پانچ سال میں اس قدر تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہوں کہ "خوشبو" اور "صد برگ" کے مابین مقابلہ کی نوبت آجائے۔ لیکن یہ حادثہ رونما ہو چکا ہے اور اس رونمائی کی جانب اشارہ اس قدر اہم خبر نہیں جس قدر کہ خود حادثہ۔

"صد برگ" ایک ردِ عمل کی پیداوار ہے۔ "خوشبو" کی کامیابی شاید خود پروین شاکر کے لئے بھی حیران کن تھی۔ اس مجموعۂ کلام پر بیشتر تبصرہ نگاروں، نقادوں اور قارئینِ ادب نے اس مجموعہ کی شیرینی، احساس تحیر اور جذباتیت کے دفور کو پروین شاکر کی کم عمری کے کھونٹے پر ٹانگ دیا تھا۔ پروین شاکر، غالباً "صد برگ" میں شامل نظموں اور غزلوں سے یہ تاثر دینا چاہتی ہیں کہ وہ "خوشبو" کے بارے میں اس خیال آرائی سے مطمئن نہیں ہیں اور وہ اس طرح کہ "صد برگ" کی بیشتر تخلیقات زمان ومکان، کا اثبات کرتی ہوئی ملتی ہیں۔ پروین شاکر نہ صرف انگریزی ادب بلکہ گذشتہ ایک دہائی میں ادب اور فلسفہ کے حوالہ سے در آئے ہوئے بہت سے مباحث کی ٹہنیوں پر اپنی "ناختہ آواز" کے دستخط کرتی ہوئی ملتی ہیں۔ جیسے اُن کی شاعری کا "عاشق" ریشمی اور نازک احساسات کے دفور کو ماہنامہ "زیب النساء" اور "حور" جیسے جرائد کی قارئین کا حُسنِ طلب سمجھتا ہو۔

پروین شاکر کے یہاں "عشق" کا وہ تصور نہیں ہے جو اُن کے قبیل کی دوسری شاعرات کے یہاں ملتا ہے بلکہ وہ "عشق" اور "بے خوفی" میں شمہ برابر فرق روا

نہیں رکھتیں، ہاں، یہ ضرور ہوا ہے کہ ان کی شاعری نے "عشق" کی بوالہوسی کا الزام قبول کرنے کے بجائے اُسے "برابری" کی سطح پر قبول کرنے کے لئے نعرۂ مستانہ بلند کیا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ پروین شاکر نے "صد برگ" میں اُن حضرات کی دلبستگی کا سامان بھی فراہم کیا ہے جو صنفِ نازک کی جانب سے اظہارِ شوق کو تاہنوز جسارتِ نازیبا قرار دیتے ہیں۔ وہ جب چاہتی ہیں اپنے عشق کے سامنے سپرانداز ہو جاتی ہیں اور جب چاہتی ہیں اُسے اپنی جذباتیت کا نشانہ بنا کر گھور اندھیرے میں چھوڑ آتی ہیں کہ بہرحال وہ عشق ہی کیا جس کو ثبات ہو اور ایک نقطۂ ذات پر فکر پر دعویٔ استمرار ہو۔ غالباً اُنہوں نے بہت کم مدت میں بہت زیادہ لکھا ہے اور ہر "صورتِ حال" پر اپنے دستخط کرنے کی غرض سے لکھا ہے اس لئے ہم "صد برگ" میں لہجہ کی جذباتیت کے ساتھ ساتھ باہم متصادم اجزائے فکر کو مجمع البحرین ہوتے ہوئے دیکھنے کے بجائے بسا اوقات ایک دوسرے کے خیال سے آزاد ہوتا ہوا دیکھتے ہیں جیسے کہ تصادم کسی مطلوبہ SYNTHESIS کے لئے نہ ہو بلکہ ایک بے جہت قسم کی رزم آرائی ہو۔

پروین شاکر کی شاعری میں وہ سب کچھ لوازمات موجود ہیں جن کے بغیر شعری سفرِ مناسب تو کیا ممکن بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن مجھے اُن کے دوسرے مجموعہ "صد برگ" کے مطالعہ کے دوران کچھ یوں لگا کہ جیسے وہ بیّن طور پر "خالص شاعری" کی منزل سے بے جہت پیچیدگیوں کے سفر پر گامزن ہو چلی ہوں اور "خوشبو" کے مانوس موسموں کی جانب پلٹ جانا چاہتی ہوں۔ دوسرے شعراء سے اخذ و اکتساب نئی بات نہیں ہے لیکن ایک منجھا ہوا فنکار تضاداتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی شعری دنیا کے اندرونی تضادات پر حاوی ہوتا چلا جاتا ہے اور بسا اوقات یہ کام اخذ و اکتساب کے ذریعہ بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ جس طرح ایلیٹ اور پاونڈ نے ثابت کیا ہے۔

لیکن پروین شاکر کا مجموعۂ کلام "صد برگ" آگے کی جانب سفر جاری رہتے ہوئے بھی منزلِ مقصود سے قریب تر ہونے کی مسافت معلوم نہیں ہوتا۔

پروین شاکر، ان تمام جملہ ہائے معترضہ کے باوجود، ایک شاعرہ ہے۔

ممکن ہے "صد برگ" کے بعد کی شاعری میرے موجودہ خیالات کو غلط ثابت کر دے اور اس طرح وہ مآل کار اُس منزل تک پہنچ جائے جو اُس کا مقدّر ہے لیکن پروین شاکر کی شاعری میں دلچسپی رکھنے والے ایک فرد کی حیثیت سے میری خواہش ہے کہ وہ اپنے "امکانات" کے حصول کے لئے سنجیدگی کے ساتھ کوشاں رہے۔ غیر مخلصانہ داد و تحسین بسا اوقات بے لاگ تنقید سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے چونکہ اوّل الذکر روش کی بدولت شاعر کے ذہن میں موہوم کامیابیوں کا نشہ پیدا ہوتا ہے اور اگر وہ دوسرے رویہ سے آزردہ خاطر نہ ہو سکے تو اُسے اپنی کامیابیوں کے ساتھ اپنی ناکامیاں سمجھنے کا بھی موقع فراہم ہوتا ہے۔ شاعری بہر صورت فراغت اور چین کے ساتھ شعر کہنے کا فن نہیں ہے بلکہ یہ بقول مولانا رومی

سے آں کلامت می رہاند از کلام
واں سقامت می جہاند از سقام

کے مصداق شاعری کے ذریعہ رہائی اور نجات کی جانب سفر ہے۔

اور پروین شاکر سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اس امتحان میں کامیاب و کامران ہو گی۔

محمد علی صدیقی ۔ معروف نقاد، تین کتابوں کے مصنف جن میں تنقیدی مجموعہ "توازن" کا ادبی حلقوں میں گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ اردو اور انگریزی میں یکساں سہولت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

بلقیس شاہین

صد برگ

تین چار سال کی مختصر مدت میں پروین شاکر کے پہلے مجموعے خوشبو کے غالباً تین ایڈیشن چھپے اور فروخت ہو گئے۔ اس سے شاعری کے بارے میں آج کے قاری کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے میں نے "خاصی مدد" کا ٹکڑا اس لئے استعمال کیا کہ خوشبو کے پھیلاؤ میں شاعرہ کی ذات بھی شامل ہے اس لئے جو نتیجہ اخذ کرنے جا رہی ہوں اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مکمل طور پر درست ہے۔

حضرتِ افلاطون شاعری کو سخت اخلاقی چیز سمجھتے ہیں لہذا انہوں نے شاعری سے اصلاح معاشرہ، نوجوانوں کی ذہنی تربیت اور ریاست کے محافظوں کی بالیدگیٔ روح وغیرہ وغیرہ جیسے نر لطیفے وابستہ کر دیئے تھے لیکن ارسطو صاحب نے اُس لذت اور مسرت کا اعتراف کیا جو شاعری کے ساتھ مخصوص ہے۔ "شاعری کی یکتا لذت" یہ بات آج "چھوٹی سی" معلوم ہوتی ہے ایک بڑا انکشاف اور صحیح سمت میں ایک اہم قدم تھی ——— اور آج بھی ہے۔

ترقی پسند نقادوں اور شاعروں نے مجموعی طور پر شاعری کے ساتھ وہی سلوک کیا جو افلاطون کرنا چاہتے تھے۔ لیکن "خوشبو" شاعری کی اس مسرت کا ایک چھوٹا سا صحیفہ تھی جس کا ذکر کیا گیا۔

اور اب خوشبو کے بعد "صد برگ" کی تقریب ہے "خوشبو" سے "صد برگ" تک کا سفر پروین کے لئے نا آفریدگی سے آفریدگی تک کا سفر ہے حاسہ سے تجسیم تک کا۔

اور اس سفر میں ایک دو نہیں ہزاروں "سخت مقام" آتے ہیں

ان دنوں جو قابلِ توجہ شاعری تخلیق ہو رہی ہے وہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے ۔ ہماری شاعری کے مختلف ادوار میں ایسے قدآور شاعر پیدا ہوئے ہیں جن کے "ہم قد" ہماری نسل نے نہیں دیکھے ، لیکن شاعری کی "عمومی سطح" شاید ہی کبھی اتنی بلند رہی ہو جتنی کہ آج ہے ۔ ارسطو کی بوطیقا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ کتاب شاعری کی آزادی اور اس کے یکتا وظیفے یعنی مسرت بخشی کا جشن تھی ۔ آج بھی بوطیقا لکھی جا رہی ہے لیکن اسے کوئی ناقد نہیں لکھ رہا بلکہ ہمارے نئے شاعر مل کر لکھ رہے ہیں ۔ پروین شاکر بھی "ان" میں نمایاں ہے ۔ ان دنوں عالی جی نے اُن پرانے شاعروں کی یاد دلانے کا سلسلہ چھیڑ رکھا ہے جنہیں بھلا دیا گیا یا جن کے مجموعے تیس تیس چالیس چالیس سال کی جگر کاری کے بعد شائع ہوئے ہیں ۔ ذہن میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں پروین کا یہ دوسرا مجموعہ قبل از وقت تو نہیں ؟ ویسے تو ہر بات کے بارے میں دو انتہائی رائیں دی جا سکتی ہیں "پروین" کی زود گوئی کے بارے میں اگر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ۔

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

تو لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعری پروین کے لئے ویسی ہی فطری بات ہے جیسے عورت کے لئے جاگتے کے سپنے دیکھنا لیکن میری اپنی رائے میں "سچائی" ان دونوں کے بیچ میں کہیں ہمیں اپنی "دید" کی دعوت دے رہی ہے ۔

"خوشبو" اور "صد برگ" ان دونوں ناموں میں رشتے ہیں اور فاصلے بھی یہ نام پروین کی شاعری کا اشاریہ ہیں پروین نے "رزق ہوا" کے نام سے جو ابتدائیہ لکھا ہے اُس سے اُس جبر کا اندازہ ہو سکتا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو گرفتار

جانتی ہے اور جس کے خلاف احتجاج نے اُس کی شاعری کے اطراف میں تنوع اور وسعت پیدا کردی ہے۔ "سوچ کا گناہ" ہونے کی مجبوری" جس نے پاؤں پتھر اور آنکھیں پانی کردیں۔ اس تحریر میں بنیادی صداقتیں بھی ہیں مگر احتجاج میں رقت کا جو انداز آگیا ہے اس سے اخباری اصطلاح کے مطابق "اتفاق کرنا ضروری نہیں"۔ یہ مسائل اور یہ جرم تو ہر اُس معاشرہ میں جیسا ہمارا معاشرہ ہے ہر وہ فرد کرتا ہے "جو ہے" اور "ہے وہ" جو یہ کہہ سکے کہ "میرا فکر میرا وجود ہے" شاید اس رقت کا سبب یہ ہے کہ وقت کا جبر جس ذات کو میدانِ کارزار تک لے آیا ہے وہ اپنے آپ کو سنڈریلا سمجھنے اور کہنے سے دلچسپی رکھتی ہے، جب ہی تو گم شدہ قدروں کے احساس زیاں کے ساتھ ساتھ جوتیوں کے غائب ہونے کا ماتم بھی ہے۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اس تضاد نے پروین کی شاعری کو "مزے" کی چیز بنادیا ہے۔ جسم و جاں، لمحہ وصال سے ظل الٰہی کے مسائل تک۔ اور یوں پروین کی شاعری میں کچی عمر کے خوبصورت رنگوں کے ساتھ ساتھ مسائل کی آنچ کا رنگ بھی جھمک اٹھا اسی لئے صد برگ کی غزلوں کا منظر نامہ خوشبو کی غزلوں کے منظر نامے سے مختلف ہے۔ یہاں جنگل آنکھوں میں سما گئے ہیں، رات چاند سے محروم۔ چھاؤں وہاں ہے جہاں دھوپ کڑی نہیں اور جہاں اہلِ خبر اور اہلِ نظر کھڑے ہیں وہاں کوئی شجر نہیں۔

برہنہ شاخوں کا جنگل گڑا تھا آنکھوں میں
وہ رات تھی کہ کہیں چاند کا گزر ہی نہ تھا
تمہارے شہر کی ہر چھاؤں مہربان تھی مگر
جہاں پہ دھوپ کڑی تھی وہاں شجر ہی نہ تھا

یہ بے شجر دھوپ ہمیں پروین کی نظموں پر بھی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے اور

یہ نظمیں تو ہمارے وطن کا ذکر ہیں۔

سو اب یہ شرطِ حیات ٹھہری
کہ شہر کے سب نجیب افراد
اپنے اپنے لہو کی حرمت سے منحرف ہو کے جینا سیکھیں

یہ شرطِ حیات نجیبوں کے لئے پہلے بھی امتحان بن کر آتی رہی ہے۔ بار بار تاریخ کے ہر دور میں۔ اور ہماری شاعرہ کی طرح ایسے لوگ موجود تھے جن کے ہوتے اُن کی نسلوں کو کوئی کم نسب قرار نہ دے سکا..... صد برگ کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ پروین نے اپنی ذات سے باہر دیکھنا بھی سیکھ لیا ہے اس مجموعہ میں کئی نئے رنگ نظر آتے ہیں۔ مناظر اور مقامات پر اُس کی نظمیں اُردو شاعری کا نیا رنگ ہیں مناظرِ فطرت پر جس انداز کی نظمیں لکھی گئی ہیں (نانظر، اقبال اور جوش سے قطع نظر) ان کو پڑھ کر دل بہت کڑھتا ہے۔ خاص کر یوں کہ ہماری شاعری بہت خوبصورت ہے اور نظموں میں فطرت کے حسن کی اوپری سطح بھی نہیں ملتی۔ کالام' نیلم تیرے کتنے رنگ، "اسلام آباد۔ علی الصبح" —— ان تمام نظموں میں پہلی نظر کی تازگی ہے۔

صد برگ کی کئی نظمیں شخصیتوں سے متعلق ہیں۔ تاریخی، نئی اور پرانی شخصیتیں۔ یہ نظمیں صرف ان کی ذاتوں تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک نئی سمت ہیں، یہ شخصیتیں مختلف دھاروں کی علامتیں ہیں ان شخصیتوں میں حسین ابن علی بھی ہیں جن کی ذات کو پروین نے ان کے آخری الفاظ کے آئینے میں دیکھا ہے۔" اے جگ کے رنگ ریز' ذاتِ لامحدود سے شروع ہو کر خسرو تک آئی ہے۔ محدود سے لامحدود تک کا سفر تو طریق عام ہے، پروین لامحدود سے محدود کی طرف آئی ہے۔ خسرو مرشد کا نعرہ۔ فنا میں بقا کی تلاش ہے۔ پروین نے اپنے عہد میں اپنے سے عمر میں خاصی

بڑی شخصیتوں کے ساتھ اپنا جو رشتہ تلاش کیا ہے وہ مطالعہ کا دلچسپ پہلو ہے
مثلاً فراقؔ ——— عینی وغیرہ ——— دو سال پہلے پروین کے "سفر بند" نے اس پر
ماضی کے اُس دریچے کو کھول دیا جو اُسے روایتوں کے محل کے اس مرکزی حصّے تک
لے گیا جہاں ہماری ثقافت کا دیوانِ عام بھی ہے اور دیوانِ خاص بھی اور یوں ہم
دیکھتے ہیں کہ صد برگ کی کئی نظمیں ثقافتی نظمیں ہیں اِس مجموعہ کی کئی نظموں کے
انگریزی عنوانات بھی مطالعہ کا دلچسپ موضوع بن سکتے - کیا یہ اُردو کا عجز
ہے؟ کیا یہ دوسری زبان میں نکھرے ہے؟ کیا یہ عنوانات اُن مسائل اور الجھنوں
کی نشان دہی کرتے ہیں جو مغربی اثرات کی پیدا کردہ ہیں؟ کیا یہ اپنے معاشرے
سے بے چینی کا اظہار ہے؟ کیا یہ اپنی علمیت کا اظہار ہے؟ مجھے نہیں معلوم

"اس راز کو پروین کی بصیرت ہی کرے فاش"

لوگ عام طور پر یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ پروین بہت تحسین طلب ہوگئی
ہے - میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتی - اُس کی ایک نظم ایسے معترضین کو خاموش کرنے
کے لئے کافی ہے جب ناقدوں نے ایک تصویر مصوّرہ کے فن کی تعریف میں اپنے علم و
ذخیرۂ لغت کے امکانات کو ختم کر دیا تو اُس خود شناس مصوّرہ نے کہا۔

اتنے بھرپور اور جاں فزا تبصروں کے لئے
آپ سب کی تہِ دل سے ممنون ہوں
مگر قبل اس کے
کہ مجھ مبتدی کے لئے
داد و تحسین کے ٹکراؤ میں
آپ کے سر پھٹیں

ناقدینِ کرام

اپنی باچھوں سے بہتی ہوئی

رال تو پونچھ لیں

پروین پر میری شاگردی کا بھی الزام ہے اور وہ یہ جانتی ہی ہیں کہ ہمیں جو فنکار جتنا عزیز ہوتا ہے ہمارے مطالبے اُس سے اتنے ہی شدید ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی امکان کو ممکن بنا دیتا ہے تو ہم تمنا کے دوسرے قدم کے لئے دیدہ و دل وا کر دیتے ہیں۔

امید ہے کہ کتابوں کے تعارف کے اس دور میں پروین اس نکتہ کو یاد رکھیں گی۔

(یہ تبصرہ صدبرگ کی تقریب میں پڑھا گیا)

بلقیس شاہین:- سرسید گرلز کالج میں اردو کی استاد رہی ہیں۔ کچھ عرصہ اعزازی طور پر جامعہ کراچی میں پڑھایا۔ ایک ناول "خلش کہاں سے ہوتی" شائع ہو چکا ہے۔ اردو کے جدید شعری مجموعوں پر اُن کے تبصرے کتابی صورت میں شائع کئے جا رہے ہیں۔

ایک کتاب ایک نقّاد

دریا آخر دریا ہے

ابوالخیر کشفی

شام کا پہلا تارا

بلقیس شاہین

ابوالخیر کشفی

دریا آخر دریا ہے

آج پہلی کتاب جس پر گفتگو مقصود ہے امید فاضلی کا شعری مجموعہ ہے۔ "دریا آخر دریا ہے"۔

کتاب کھولنے سے پہلے ہی آدمی بہت دیر تک جمیل نقش کے بنائے ہوئے سرورق میں گم رہتا ہے۔ جمیل نقش چہرے سے چہرہ اور نقش سے نقش اُگاتے ہیں۔ اُن کے تخلیقی عمل میں نمو کی یہ شان اکثر نظر آتی ہے۔ رنگوں کے انتخاب سے وہ جُز کو ابھارتے ہیں اور رنگوں کے امتزاج سے وہ اجزا کو ایک کُل بنا دیتے ہیں۔

اس مجموعے کو امید فاضلی نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۹ء تک کی غزلیں ہیں اور دوسرے حصے میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۰ء تک کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ وقت میں الٹا سفر شعر و ادب کی تفہیم کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بالخصوص ایسے شاعر کی تفہیم میں جس کی شعر گوئی کی عمر کم و بیش چالیس سال ہو۔ فراق صاحب کا مصرع ہے۔

میں نے اس آواز کو مر مر کے پالا ہے فراق

وقت کے اس سفر میں شاعر کا ساتھ دینے والے قاری کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آواز جو محرابِ وقت میں گونج بن سکے اور شمع کی طرح روشن ہو سکے، کن مرحلہ ہائے کرب اور کن تجربوں سے گزر کر تخلیق ہوتی ہے۔

امید فاضلی کی ابتدائی شاعری میں اُس عہد کی غزل گوئی کی روایت، شاعروں

کے موضوعات اور مقبول لہجے سبھی موجود ہیں۔

رخصت اے میرے تقدس، اے مری توبہ سلام

آج اک تقویٰ شکن کا سامنا ہونے کو ہے

بکھری ہے اس قدر مرے شانوں پہ زلفِ یار

اب اپنی سانس سے مجھے آتی ہے بوئے دوست

۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۰ء تک کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ تک کے زمانے کی غزل گوئی پر جگر مراد آبادی کے اثرات کا جائزہ اب تک نہیں لیا گیا۔

اچھے شاعر کے ابتدائی نقوش میں کچے رنگوں اور لہجے کے باوجود اس کے مستقبل کے فن اور آواز کی جھلک ضرور موجود ہوتی ہے۔ امید فاضلی کے پہلے دور کی غزل ہی میں "دریا" کی علامت اپنے تمام کناروں، موجوں اور تلاطم کے ساتھ اُبھرتی نظر آتی ہے

جہاں بھی پیاس نے خود کو سمیٹنا چاہا

بڑھا دیا ہے وہیں تشنگی کو دریا نے

ہماری نئی غزل میں نئی حسیت کا اظہار جن رموز و علائم کے ذریعہ ہوا ہے اُن میں "شہر"، "صحرا"، "گھر"، "دریا"، "ہوا"، "تنہائی اور اُن کے تلازمے مثلاً پتہ، ورق، جزیرہ اور شجر، سایہ، دھوپ وغیرہ زیادہ نمایاں ہیں —— ان علامتوں پر شماریاتی کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ بات تیقن کے ساتھ کہی جا سکے کہ کس شاعر نے کس لفظ کو نئی وسعتیں عطا کی ہیں۔ امید فاضلی کے مجموعے کے نام ہی سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دریا اُن کے ہاں اپنے اس عہد کے مسائل اور انسانی

مقدر کی مختلف جہتوں کی علامت ہے ـــــ "دریا آخر دریا ہے" اس ٹکڑے میں آخر کے لفظ میں کیسا جبر ہے۔ اس جبر کا احساس اور دریا کی ان سمتوں کا سُراغ امید فاضلی سے پہلے بھی ہمیں اپنی غزل میں ملتا ہے ؎

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے

اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

لیکن امید فاضلی کے ہاں دریا، شہر بھی ہے، حالات کا نام بھی ہے، اپنی ذات کا استعارہ بھی ہے ـــــ ہمارے عہد میں اگر آدمی نے ایک چہرہ پر دوسرا چہرہ سجا لیا ہے تو زندگی نے رخ بدلنا سیکھ لیا ہے، یوں زندگی اُس دریا کی مثال بن گئی ہے۔ جو رخ بدلتی ہے تو زرد دریا کی طرح بستیوں کو صحرا بنا جاتی ہے۔

جانے کب طوفان بنے، اور رستہ رستہ بچھ جائے

بند بنا کر سو مت جانا، دریا آخر دریا ہے

اس مختصر تبصرے میں تفصیل کی گنجائش نہیں، اور نہ امید فاضلی کی غزل کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن ہے ـــــ لیکن ایک نمایاں خصوصیت کا ذکر لازم ہے۔ امید فاضلی کی شاعری انسانی ذات کے نمود اور جدوجہد کی شاعری ہے۔ انسان بیک وقت کتنا بڑا اور کتنا چھوٹا ہے۔ چھوٹا اتنا جیسے فٹ بال پر چیونٹی ـــــ بڑا اتنا کہ اس عالم کبیر کے مقابل خود عالم صغیر ہے۔ امید کے لہجہ میں المیہ ڈرامے کے ہیرو کی عظمت ہے ـــــ دریا آخر دریا ہے ـــــ لیکن زخم دل و جاں، تیشۂ الزام، اور اندھی ہوا کے تیروں کا مقابلہ ـــــ یہ انسان ہی کا حوصلہ ہے۔ امید کا لہجہ، اُن کی انا کا اعلان اور آواز ہے ـــــ یہی اُن کا بنیادی موضوع بھی ہے اور اسی نے اُن کی غزل میں وحدت پیدا کر دی ہے ـــــ وہ وحدت جو فکر در آغوش ہے ؎

ہمیں نے روک لیا سر پہ تیشۂ الزام — وگرنہ شہر میں کس کس کے سر گئے ہوتے
ہمیں نے زخمِ دل و جاں چھپا لئے ورنہ — نہ جانے کتنوں کے چہرے اُتر گئے ہوتے
جو تیر اندھی ہوا نے چلائے تھے کل رات — نہ ہوتے ہم تو نہ جانے کدھر گئے ہوتے

لہجے میں یہ قوت، اخلاقی اقدار پر ایمان سے آتی ہے۔ امید فاضلی نے اخلاقی قدروں کو جس طرح تغزل کے لہجے میں ڈھالا ہے اُس کی مثال اُن کے ہم عصروں کے ہاں مشکل سے ملے گی ؎

دلوں کو زخم نہ دو حرفِ ناملائم سے — یہ تیر وہ ہے کہ جو لوٹ کر بھی آتا ہے

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

بلقیس شاہین

شام کا پہلا تارا

چلو کہ آگ لگا دیں چمن میں ہم نفسو
سکوت لالہ یہ خنداں ہے گریۂ شبنم

پتہ نہیں کہ شعلۂ نوا سے اب بھی چمن میں آگ لگ سکتی ہے کہ نہیں؟ اور کسی کا ترانہ کارواں کے لئے بانگ درا بن سکتا ہے یا نہیں لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ جب مشاعرے کے اسٹیج پر زہرہ نگاہ شعر پڑھتی تھیں تو مومن خاں مومن کی آواز ہمارے حافظے اور لبوں کے ذریعہ انہیں داد دیتی ؏ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو"

مشاعروں میں خواتین کی شرکت کا دور بزرگوں کی روایت کے مطابق، قیام پاکستان سے پہلے شروع ہو گیا تھا، لیکن یہ بات صرف زہرہ نگاہ کے لئے کہی جا سکتی ہے کہ وہ آئی، اُس نے غزل پڑھی اور مشاعرہ فتح کر لیا۔ شاعر خواتین میں ادا جعفری کو زمانی سبقت حاصل ہے مگر وہ دور بنیادی طور پر ان کی نظم گوئی کا دور تھا۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر کا زمانہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ویسے مجموعی طور پر آج بھی یہ بات درست ہے کہ عورتوں میں سے اگر کسی نے مشاعروں پر حکمرانی کی ہے تو وہ زہرہ نگاہ ہیں۔

بھلا یہ بات مردوں کو کب گوارا ہوتی، ہمارے ہاں ادب ہو یا زندگی مرد یا تو عورت پر نظر رکھتے ہیں یا اُسے نظر انداز کرتے ورنہ سرپرستانہ لہجے میں بات کرتے ہیں لہٰذا ہم نے سنا کہ ان کے ایک عزیز بزرگ ان کو شعر کہہ کر دیتے ہیں۔ اندر سے جب کوئی معاشرہ بیمار ہوتا ہے تو ایسی باتوں پر فوراً یقین کر لیا جاتا ہے

جھوٹ کے لئے شہادت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا اور سچ پر شہادتوں اور گواہیوں کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔

اور ہم نے دیکھا کہ اُن لوگوں نے شعر خوانی کے وقت زہرہ نگاہ کی آنکھوں میں ماضی کی خاکستر میں حال کے شعلوں کی چمک، لہجہ کے اتار چڑھاؤ میں ذاتی تجربہ کے اظہار اور شعلۂ نوا میں معاشرے کے پر تو کی شہادت کو نظر انداز کر دیا۔ بات یہیں تک محدود نہیں رہی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بزرگ نے طنزاً ارشاد فرمایا کہ "لو بھئی اب موضوع غزل بھی غزل سرا ہو گیا"۔ وہ بزرگ بھی غزل گو بھی تھے۔ احترام کے ساتھ دبی زبان میں میں نے جواب دیا۔ "آپ نے اس موضوع سخن کے ساتھ جو ذہنی بدسلوکیاں کی ہیں انہوں نے اُسے سخن سرا کر دیا"۔

زہرہ نگاہ کا مجموعہ جب ہمیں ملا تو پہلے ہمارے "انہوں" نے پڑھنا شروع کیا اور پھر بولے بیشتر غزلیں تو روایتی ہیں۔ (جیسے کسی اظہار کا روایتی ہونا خامی ہو) ۔ مگر مجھے پتہ نہیں تھا کہ زہرہ نگاہ ایسی اچھی نظمیں لکھتی ہیں اس مجموعہ میں ایک نئی زہرا نگاہ سے ملاقات ہوئی ہے" اور میں نے عورت ہونے کے ناتے اس پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور چونکہ مجھے خود کتاب حاصل کرنے کی جلدی تھی لہٰذا بحث و مباحثہ سے کترا کر مطالعہ شروع کیا اور معلوم ہوا کہ "صاحب" نے فیصلہ بڑی روا روی میں کیا ہے۔

اس مجموعہ میں زہرہ اپنی شخصیت کی سالمیت کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی غزلوں کے ادوار کی فیض صاحب نے اپنے مختصر دیباچے میں نشان دہی کی ہے، مگر یہ صرف مرحلہ ہائے ہنر ہی نہیں بلکہ یہ مرحلہ ہائے ذات ہیں جس سے ہماری شاعرہ گزری ہے پہلے دور میں دل و نگاہ کے معاملے اُس لہجے میں جو ہماری تہذیب کا عطیہ ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ اس عہد کی سیاست اور زندگی غزل کے

پیرائے میں

اک وسعتِ خیال کہ لفظوں میں گھر گئی
لہجہ کبھی جو ہم کو کرم آشنا ملا
میں تجھے ڈھونڈوں مگر عمر گریزاں کی طرح
تو مجھے دیکھے مگر خوابِ پریشاں کی طرح
کہاں کے عشق و محبت کہاں کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لئے

اس کے بعد زہرا نگاہ پران کی اپنی ذات کی بعض نہیں، وا ہوئیں ہم میں سے ہر آدمی تہذیبی آثار کی طرح ہوتا ہے۔ یہاں بھی ہر تہ زمین کی تہوں کی طرح مختلف تہذیب اور دور کی کہانی ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت ماضی کی تہذیب کی اس طرح امین ہوتی ہے کہ اس کا ماضی اس کا میکہ، سہیلی کے روپ میں یوں ظاہر ہوتا ہے۔

وہ ڈوبتی ہر کرن کے ہمراہ میرے گھر میں براجتی ہے...
وہ جاگتی ہر کرن کی سنگت میں اپنے رستے سدھارتی ہے

اس کا حال اس کا دوسرا دور ہے روشن آنگن، کھلے گھر کی مالکہ ہی نہیں بناتا بلکہ کسی اور کی آنکھوں کے آئینے میں اپنا سراپا دیکھنا بھی سکھاتا ہے۔

اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا
کتنے دن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا

لیکن سکھ کی دھوپ کے ساتھ دکھ کی چھایا بھی اس کے وجود کو یوں گھیرے میں لیے رہتی ہے، وہ اس طرح کہ وہ کسی کو محض اپنی زندگی کی راہ کا مسافر دیکھنا چاہتی ہے، اُسے روزی کی بھٹی کا ایندھن بنتے دیکھتی ہے اور کچھ نہیں کر پاتی۔

ہنستی بستی راہوں کا خوش باش مسافر
روزی کی بھٹی کا ایندھن بن جاتا ہے
دفتر منصب دونوں ذہن کو کھا لیتے ہیں
گھر والوں کی قسمت میں تن رہ جاتا ہے

اسی دور میں مسافر نگری نگری پھرتا ہے اور نئے آفاق نظروں کے سامنے آتے ہیں، ذہن کا افق وسیع تر ہوتا ہے اور اپنے چاروں طرف کی دنیا سے نیا ناتا قائم ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی خالی خالی نظر آتی ہے

اب اس گھر کی آبادی مہمانوں پر ہے
کوئی آجائے تو وقت گزر جاتا ہے...

جذبات اور جنسیت کو اس درجہ نثر نما لہجے سے معتدل بنانا بہت بڑی ادبی فتح ہے اگر ڈھونڈیئے تو میرا جی کو اس باب میں سب کا استاد پائیے گا اور وقت گزرنے کے ساتھ اس ذکر کے ساتھ ساتھ "نائٹ شفٹ" "ایران" "ویت نام" اور "جنوبی افریقہ" جیسے مسائل شاعرانہ تخیل کے ناخن سے یوں وا ہوتے ہیں کہ نظم بن جاتے ہیں۔ دنیا جو فاصلے سمٹنے کے بعد بہت سے کمروں کا ایک گھر بن گئی ہے زہرا نگاہ کی شاعری کا موضوع ہے اسی دنیا کے حدود میں اب فضا اور خلائے بسیط کا اضافہ ہو گیا ہے جب جدید سائنسی دور کی آمد آمد تھی تو مغرب کے نقادوں نے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ سائنس اشیاء اور کائنات کی رمزیت چھین لے گی اور اس کی زد تخیل پر پڑے گی اور شاعری کا کام مشکل ہو جائے گا مگر سائنس کی فتوحات شاعری سے کچھ بھی نا چھین سکیں۔ چاند پر آدمی کے قدم پہنچ گئے مگر یہ علامت قائم اور زندہ ہے۔ سائنسی فتوحات اور ایجادات شاعری کا موضوع بن گئیں لیکن ایسی بیشتر شاعری بیانیے کی حد سے آگے نہیں بڑھ پائی۔

زہرا نے سائنسی ایجادات کو بھی اوپری طور پر بیان نہیں کیا بلکہ انہیں گہرے ذاتی تجربے میں بدل دیا ہے "CON CORDE" پر ان کی نظم میرے دعوی کی دلیل ہے۔

تخیل اور ذات سے ذات تک کا سفر آواز سے تیز طیارے کی رفتار سے بھی تیز تر ہوتا ہے معراج طیارے کا حق نہیں انسان کا منصب ہے۔

"شام کا پہلا تارا" ایک شعری مجموعہ بھی ہے ایک ادبی وعدے کا ایفا بھی ہے اور ایک ذہین شخصیت کے ارتقاء کے مراحل کی نقاب کشائی بھی۔

(یہ تبصرہ کتاب کی تقریب میں پڑھا گیا)

ایک بات

سیّد ابوالخیر کشفی

کچھ اپنی کچھ ادبی صورتِ حال

رفتار کا دوسرا قدم آپ کے سامنے ہے۔ اس سلسلہ کا پہلا مجموعۂ مضامین نثر و نظم شعبۂ اردو جامعۂ کراچی کی جانب سے آپکی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، اب یہ مجلسِ مطبوعات و تحقیقات اردو کی پیش کش ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اور انگریزی کے سلسلہ نیوڈائرکشنز (NEW DIRECTIONS) کی طرح ہمارے ادب کی روایات، حال اور مستقبل کو سمجھنے اور سمجھانے کے ساتھ ساتھ اردو کی بین الاقوامیت کو نمایاں تر کرنے میں نمایاں حصہ لے گا۔ مطبوعات کے سلسلے میں جامعۂ کراچی میں وہ کچھ نہیں ہو سکا۔ جس کی ملک کی سب سے بڑی جامعہ سے توقع کی جا سکتی تھی، بہر حال مجلسِ مطبوعات بھی بنیادی طور پر جامعۂ کراچی، بالخصوص اس کے شعبۂ اردو کے اساتذہ کے کاموں کو پیش کرنا چاہتی ہے۔ اور یوں ہم جو کچھ بھی حاصل کر سکیں گے اس سے جامعۂ کراچی کے علمی وقار میں اضافہ ہوگا۔

ہماری زبان میں علمی مطبوعات کی روایت خاصی مضبوط رہی ہے۔ لیکن آج لوگ گٹ اپ کے ضروریات سے زیادہ قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ رفتار نمبر ا کو دیکھ کر شعبۂ اردو کے ایک سابق

طالب علم نے بڑے جذباتی اور رقت آمیز لہجے میں کہا تھا "یہ ہے شعبۂ اردو کی پیش کش۔ اسے دیکھ کر شرم آتی ہے" مطمئن تو ہم بھی نہیں تھے، مگر عزیزِ مکرم کو شرم بالکل غیر ادبی بنیادوں پر آئی تھی۔ پہلی جلد میں یقیناً دو اہم مضمون شامل تھے۔ ایک تو جاپانی ادب پر پروفیسر کان کاگایا کا مضمون، اور دوسرا میر محفوظ علی بدایونی پر پروفیسر ابواللیث صدیقی کا مضمون۔

اردو کے کسی غیر ملک کے عالم یا ادیب کا ایک مقالہ ہم ہر جلد میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس بار جناب چھوچھی تنگ (عوامی جمہوریہ چین) کا مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ یہ مضمون اردو کے بارے میں ان کی محبت کا اظہار بھی ہے اور ہمارے لئے ایک آئینہ بھی!

"رفتار" نے کتابوں کو مناسب اہمیت دی ہے اور انشاءاللہ ہم کتابوں پر ایسے تبصرے شائع کرتے رہیں گے، جو رسمی نہ ہوں اور تنقیدی اہمیت اور قدر و قیمت رکھتے ہوں۔ ایک کتاب دو نقاد" کا سلسلہ ہمیں عزیز تھا اور عزیز ہے، مگر افسوس کہ اس باب میں ہمیں اب تک زیادہ تعاون حاصل نہیں ہو سکا۔ امید ہے کہ لکھنے والے اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

ہم قصۂ جدید و قدیم کو "دلیلِ کم نظری" سمجھتے ہیں۔ اسی لئے پہلی جلد میں قومی زندگی کے اکابر کی یاد تازہ کی گئی اور اس جلد میں جواں سال شاعر سلیم کوثر بھی "رفتار" کی رفتار کی ایک مثال ہیں۔ ان کے بارے میں ایک مختصر تحریر اور ان کی تازہ غزلیں آپ کی نظر سے گزریں گی۔

"کتاب در کتاب" (چاہیں تو کتاب اندر کتاب کہہ لیں) کا سلسلہ آپ کو پسند آئے گا۔ اس جلد کے ساتھ جناب جمیل نقوی کی کتاب "رودادِ لہورنگ" پیش کی جارہی ہے۔ رفتار میں ہر بار ایک مستقل کتاب آپکی خدمت میں پیش کی جائے گی۔

ہمارا معاشرہ بہت کچھ بگڑ کر اور اپنی اقدار کو کھو کر، آج بھی ایسا معاشرہ ہے جس میں ادب کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ تنقید کا عمل بھی مختلف درجوں میں مختلف سطحوں پر نظر آئے گا۔ جناب اے۔ کے سوار ملک کے ایک ممتاز صنعت کار ہی نہیں بلکہ ہماری جدوجہدِ آزادی کے مراحل دیتے میں شامل رہے ہیں۔ انہوں نے اس جدوجہدِ آزادی کو اقبال کی مدد سے اس کے حقیقی تناظر اور

پس منظر میں سمجھا ہے۔ فاران کلب کے ایک جلسہ میں انہوں نے جو برجستہ تقریر کی تھی اس میں اپنے مطالعہ کو اقبال کے فارسی کلام تک محدود رکھا تھا۔ وہ تقریر ٹیپ سے کاغذ پر منتقل کر کے آپکی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

اے۔ کے سومار صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو سنجیدہ ادبی اور علمی کاوشوں کا دامن وطنِ عزیز کے مستقبل سے باندھتے ہیں۔ انہوں نے رفتار کی مستقل اشاعت سے دلچسپی لی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کتابی سلسلہ کو اُنکی توقع کے مطابق بنائیں۔

احمد مرزا جمیل صاحب کو حکومت نے "نوری نستعلیق" کی اہمیت کے پیشِ نظر تمغۂ امتیاز سے نوازا ہے۔ "نوری نستعلیق" کو "عہد ساز ایجاد" قرار دینا، اپنی زبان کے ارتقاء سے باخبر ہونے کی دلیل ہے، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن ایجادوں کے نتائج ہماری کوششوں اور عمل سے مرتّب ہوتے ہیں۔ وفاقی وزارتِ تعلیمات نے دو کتابیں، کمپیوٹری نستعلیق میں شائع کی ہیں اور بس (روزنامہ جنگ لاہور تو اسی مشین کے ذریعے چھپتا ہے) وہ وقت کب آئے گا جب ہماری درسی، علمی اور ادبی کتابیں اس کمپیوٹری مشین کے ذریعہ چھپیں گی اور خواندگی کی مہم اس کے ذریعہ نئے دائرے بنتی ہوئی نظر آئے گی ؟ اس سوال کا جواب ہمیں دینا ہے، کسی اور کو نہیں۔ نوری نستعلیق کے بارے میں چار تحریریں پیش کی جا رہی ہیں۔ ایک تو احمد مرزا جمیل کے قلم سے ہے، دوسری اردو کے تاریخ ساز رسالہ "نقوش" کے مدیر کے قلم سے ہے۔ تیسری تحریر ہندوستان کے ممتاز اسکالر جناب حسن الدین احمد کی ہے جو اردو لفظ شماری پر اپنے کام کی بنا پر علمی حلقوں میں حد درجہ اعتبار کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور چوتھی تحریر ایک نوجوان خاتون کے قلم سے ہے —— ایسی لکھنے والی کہ ہمارے افسانوی ادب کے مستقبل پر جس کی تحریر کے اثرات مرتب ہوں گے اگر اس نے اپنی ذات کے امکانات کو پوری طرح بروئے کار لانے میں کوتاہی نہ برتی۔

رفتار ۲، صورت کے اعتبار سے بھی رفتار ۱، سے بہتر ہے، اور امید ہے کہ ہمارے عزیز گرامی کو اس بار زیادہ شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ بات یہ ہے کہ ہم ارتقاء پر یقین رکھتے ہیں اور یہ نہیں

چاہتے کہ ہمارے تمام مجموعے ایک ایسے ہوں۔ اس لئے موضوعات کے تنوع کے ساتھ صوری صورتحال میں تبدیلی آئی ہے۔ پروفیسر انور شمیم دل کی خطاطی کے نمونے اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ وہ حرفوں کے صورت گر ہیں۔ صادقین کی تحریر، تنقید بھی ہے اور سند بھی۔

ملک کے غیر معمولی سیاسی حالات کے باوجود ادب کی دنیا میں کام ہو رہا ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ ہم اپنے مستقبل پر یقین رکھتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو مسلسل علمی کتابیں اور ادب قدما چھاپ رہی ہے۔ اپنے محدود وسائل کے اندر انجمن نے وہ کچھ کیا ہے جو دوسروں کے لئے باعث تقلید ہے۔ اس کا سہرا جناب جمیل الدین عالی اور پروفیسر شبیر علی کاظمی کے سر ہے۔ راولپنڈی کے فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج نے پاکستان کے ادب کا انتخاب چار جلدوں میں شائع کیا ہے اور دو نئی جلدیں زیر طبع ہیں۔ اس پر ہم کالج والوں اور بالخصوص جناب رشید امجد اور جناب فاروق علی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مقتدرہ قومی زبان بھی اردو کے حق میں ایک فضا بنانے کے لئے کوشاں ہے مگر ہم مقتدرہ کے ارباب اقتدار (یہ ترکیب مقتدرہ کے نام کی وجہ سے لکھی گئی ہے) سے یہ عرض کریں گے کہ وہ ایسے بنیادی کام یعنی نفاذ اردو کو سامنے رکھیں۔ ایک خبرنامہ کا اجراء بھی سمجھ میں آتا ہے، لیکن کسی منصوبہ بندی کے بغیر کتابیں شائع کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ پھر ہمارے قومی وسائل تکرار کار کی عیاشی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اکادمی ادبیات پاکستان، پاکستان کے ادیبوں کا تعارف نامہ مرتب کر رہی ہے، مگر مقتدرہ بھی یہی کام کرنا چاہتی ہے۔ الحمد للہ اب بیشتر علمی اور ادبی اداروں کے دائرۂ کار معین و متعین ہیں، لیکن اس باب میں مزید احتیاط کی ضرورت ہے۔

ہمارے قومی مزاج کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم کسی ادارے کو وقت نہیں دیتے کہ وہ استحکام حاصل کر سکے۔ یا پھر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مقتدرہ کو نظر انداز کیا گیا اور اکادمی ادبیات پاکستان کو مسلسل تنقید کا ہدف بنایا گیا۔ انتہا یہ کہ اہل قلم کانفرنس کو ادیبوں کی "سالانہ پکنک" کہا گیا۔ ویسے یہ بات بھی کب قابل اعتراض ہے۔ آخر قلم کاروں کا معاشرہ اور زندگی پر اتنا حق تو ہے ہی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے تخلیقی ذہن جمع ہوں اور ایک دوسرے سے کچھ نہ سیکھیں۔ یہ شخصی تعارف بھی ایک اہم بات

ہے۔ اکادمی سے بھی یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہر سال مندوبین کی فہرست میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں تاکہ نئے اہلِ قلم بھی شرکت کر سکیں۔ اہلِ قلم کے مرتبہ کے تعین کے چکر میں پڑے بغیر یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ مراتب کا تعین تو وقت کرے گا۔

اکادمی ادبیاتِ پاکستان صحیح سمت میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ادیبوں کی امداد کے علاوہ اس کی مطبوعات کا پاکستان میں ادب کے مستقبل اور رجحانات سے گہرا رشتہ ہے۔ اردو غزلوں کے انتخاب کے بعد اردو نظم کا انتخاب مرتب کیا جا رہا ہے۔ اور اردو افسانوں کے انگریزی تراجم بھی کتابی صورت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ کشمیر، فلسطین، الجزائر، افغانستان، ویت نام اور دُنیا کے دوسرے ملکوں کی جدوجہدِ آزادی کے سلسلہ میں پاکستان کے ادیبوں کی منتخب تحریروں کو جمع کر کے عربی، انگریزی، فرانسیسی، چینی اور جاپانی زبانوں میں شائع کیا جائے خود اردو اور دوسری پاکستانی زبانوں میں ایسا کوئی انتخاب نہیں ہے۔ یہ تحریریں اقوامِ عالم کو پاکستانی قوم کی حریت پسندی اور عدل طلبی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے تخلیقی ذہن سے متعارف کرائیں گی۔

ہمیں اکادمی کے مسائل اور عملہ کی کمی کا علم ہے، مگر ہماری دانست میں وہ وقت آگیا ہے کہ اکادمی کو اپنے مجلہ کی اشاعت بغیر کسی تاخیر کے شروع کر دینی چاہیے۔ اکادمی کی کانفرنسوں میں پڑھے جانے والے مقالات کی اشاعت مجلّہ کے صفحات پر موزوں تر رہے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ اکادمی کا یہ سفر اسی طرح نئی منزلوں کی تلاش میں جاری رہے گا۔ آخر میں رفتار کے حوالے سے میں ممتاز اور کلاسیکی روایات کے امین، خطاط جناب وسیم عابدی اور نہایت تخلیقی فنکار انتظار احمد صدیقی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہمیں مجلس کے نام کا طغریٰ اور "رفتار" کا سرورق عنایت کیا اور وہ بھی صرف محبت کے رشتے سے۔

ابوالخیر کشفی

یکم جنوری ۱۹۸۳ء